تعلیم و تربیت
جون
2009
اَمن کے دیپ جلائیں، ہم
بھائی، بہنیں، مائیں، ہم

69 واں سال تیسرا شمارہ

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

(رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ! ..... سلامت تاقیامت۔

ساتھیو! فضاؤں کی حد درجہ بلندی پر ایک ایسا مقام آتا ہے کہ جہاں صرف اور صرف شاہین ہی اڑنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ چڑے اور ممولے تو اس بلندی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ڈوگ واکرز ان افراد کو کہتے ہیں جو ترقی یافتہ ممالک میں مصروف افراد کے کتوں کو ماہانہ معاوضے پر صبح وشام ضروری فطری حاجت کے لیے فلتھ ڈپو تک لے جاتے ہیں، انھیں سیر کراتے ہیں اور انھیں واپس ان کے گھروں تک پہنچاتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر کتوں کے بارے ایک دستاویزی فلم دکھائی جا رہی تھی کہ امریکا کے مرکزی شہر نیویارک میں ایک ڈوگ واکر آٹھ چھ کتوں کی زنجیریں تھامے خراماں خراماں چلا جا رہا تھا کہ ایک کتا فلتھ ڈپو تک کا راستہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے بازار میں ہی مینگنیاں کر دیں۔ واکر نے اپنی جیب میں سے ایک لفافہ باہر نکالا، کتے کی مینگنیاں اس سے اٹھا کر دور پڑے ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔ تب مجھے ان ممالک کی ترقی کا ایک بہت بڑا راز سمجھ آ گیا یعنی احساس ذمہ داری۔ جس ملک کا ایک ڈوگ واکر اتنا احساس ذمہ دار ہے، وہ ملک کیسے نہیں دنیا پر راج کرنے کی طاقت حاصل کرے گا۔ اسلام اس سلسلے میں بہت واضح طور پر بتاتا ہے کہ محنت کرو اور آگے بڑھو ورنہ تمہاری مدد کے لئے کوئی آسمانی مخلوق نازل نہیں ہو گی۔

"یہودی اور عیسائی بہت چالاک ہیں، اس لئے وہ دنیا پر راج کر رہے ہیں۔" یہ وہ احمقانہ نظریہ ہے جو ہم رٹتے رہتے ہیں۔ یہودی اور عیسائی اس دنیا پر اپنی عقل، طاقت اور منصوبہ بندی کے بل پر چھائے ہوئے ہیں..... تو ہم مسلمانوں کو کس نے روکا ہے..... محنت کرو، آگے بڑھو۔

فضاؤں کی بے کراں بلندی شاہینوں کی جرأت کی منتظر ہے۔

اور ہاں اس بار بھی دو کہانیاں دہشت گردی کے خلاف موجود ہیں،

"جنگل سے جنگل تک" کا مطالبہ بھی پورا کر دیا گیا ہے۔ فی امان اللہ (مدیر)

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

جون 2009ء

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32 ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 6361310 - 6361309 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

قیمت فی پرچہ 25 روپے

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 500 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 1250 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 1250 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ لاہور
UAN: 042 - 111 62 62 62 Fax: 042 - 6278816
Email: tot.tarbiatfs@gmail.com
tot.tarbiatfs@live.com

بچوں کے لیے

درسِ قرآن و حدیث

اللہ کے محبوب بندے

سید مقبول حسین شاہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت بڑا مقام عطا کیا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے، یعنی جو بھی چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں، اُن میں انسان کا مقام سب سے بلند ہے۔ اس کے علاوہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے مسجودِ ملائکہ بنایا ہے، یعنی اُس کو ایسی خوبیوں سے نوازا ہے کہ فرشتے بھی اُس کو سجدہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے وہ ہیں جو اپنے اس اعلیٰ مقام کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں، اُن کے اعمال ایسے ہوتے جن سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور جو اُن کے لیے بخشش کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

سورۃ فاطر آیات ۲۹-۳۰: "جو لوگ اللہ کی کتاب (سمجھ کر اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے) پڑھتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے پوشیدہ اور ظاہر (غریبوں پر) خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے اُمیدوار ہیں جس میں خسارہ نہیں، کیوں کہ اللہ اُن کو پورا پورا بدلہ دے گا اور اپنے فضل سے اور زیادہ دے گا، وہ بخشنے والا قدر دان ہے۔"

ان آیاتِ مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو اتنا بڑا مقام عطا کیا ہے، اُس کا تقاضا ہے کہ ہم راہ نمائی حاصل کرنے کے لیے قرآن مجید کا مطالعہ کریں، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے نماز باقاعدہ پڑھیں اور اُس پاک ہستی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جائیں۔

صحیح حدیث میں ہے: "رسول کریمؐ نے بہت زیادہ نوافل ادا کرنے کی وجہ دریافت کرنے پر فرمایا کہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔"

اس کے علاوہ ضروری ہے کہ ہم ایک ہم درد انسان کے طور پر زندگی بسر کریں اور ہمیشہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کریں۔ اس سے رزق میں کمی نہیں آئے گی بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں اور زیادہ دے گا، نیک عمل کرنے سے ہمارے دل کو سکون حاصل ہو گا اور غریبوں کی دعائیں ہمیں جنت میں لے جائیں گی۔

پیارے بچو! آیئے عہد کریں کہ ہم ایک اچھے اور ہم درد انسان کے طور پر زندگی بسر کریں گے۔ اس سے اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہو گا اور ہماری دنیاوی زندگی اور آخرت دونوں سنور جائیں گی۔ آمین۔

مقامِ شکر

رحمتِ دو جہان کی اُمت ہیں
فضلِ پروردگار ہے ہم پر

ہے عبادت فقط خدا کے لیے
جس کا لطف و کرم ہے شام و سحر

جب ہمارے ہیں مولا رب کریم
ہم سوالی ہوں کیوں کسی در پر

رہبر و رہنما قرآن حکیم
ضو فشاں اس کا نور ہے ہم پر

طالبان خدا کے شیدا ہیں
سایہ ذوالجلال ہے ہم پر

میری نظروں میں ہیں حبیبِؐ اللہ
ان کی چشم کرم سدا ہم پر

ہیں ہمارے نبی حبیبِؐ خدا
وہ ہمارے ہیں ہم [illegible]

ان کے نقشِ قدم پہ دل ہیں نثار
ہم کو رکھا خدا کے رستے پر

حشر میں آسرا ہو بیما حق
ہو گا ان کا کرم وہاں ہم پر

(سید مقبول حسین شاہ، لاہور)

عظیم سے بھی عظیم تر

حق کے پیام بر تھے محمد عربیؐ
سب سے بلند تر تھے محمد عربیؐ
خدا کے قریب تر تھے محمد عربیؐ
تاریکی جہالت میں امید بر تھے محمد عربیؐ
عظیم سے بھی عظیم تر تھے محمد عربیؐ

بھٹکے ہوؤں کو نئی راہ دکھائی
تاریک راہوں میں روشن شمع جلائی
ہر سو روشنی اسلام کی پھیلائی
پوری زندگی تھی آپؐ کی نمونہ سچائی
عظیم سے بھی عظیم تر تھے محمد عربیؐ

کافر بھی کرتے تھے اعتراف آپؐ کی صداقت کا
ہر طرف چرچا تھا آپؐ کی امانت کا
کوئی جوڑ نہیں تھا آپؐ کی عدالت کا
کوئی مقابل نہیں تھا آپؐ کی بلاغت کا
عظیم سے بھی عظیم تر تھے محمد عربیؐ
آپؐ مجسم قرآن بھی تھے
نہایت عظیم انسان بھی تھے
ہر دم فیضان بھی تھے
ہر پل سجان بھی تھے
عظیم سے بھی عظیم تر تھے محمد عربیؐ

محمد ذیشان خان، اسلام آباد

خدا

بتائے کوئی کیا کہ کیا ہے خدا
اجالا ہے ! نور ہے ! ضیاء ہے خدا
ہر اک شے میں ہے اس کا اپنا وجود
ہر اک شے کے اندر چھپا ہے خدا
وہ رکھتا نہیں ہے سراپا کوئی
خدوخال سے ماورا ہے خدا
اسی کوزۂ جاں میں ہے وہ مقیم
اسی دل کے اندر چھپا ہے خدا
چھپائیں بھلا اس سے کس راز کو
ہر اک بات تو جانتا ہے خدا
ہے اتنا کریم اور اتنا حلیم
کہ بندوں کو بھی چاہتا ہے خدا
شب و روز تیری طرف گام زن
زمانہ تیرا نقشِ پا ہے خدا
ہمیں رحمتوں کا سزاوار کر
لبوں پر یہی اک دعا ہے خدا

شمیم فاطمہ، کراچی

بچّو! آؤ امن کے دیپ جلائیں

امن کے دیپ جلائیں، ہم
بھائی، بہنیں، مائیں، ہم

خوشیاں بانٹیں، اُچھلیں کودیں
مل کے دل بہلائیں، ہم

لڑنا بھڑنا چھوڑ دیں یکسر
اور اچھے بن جائیں ہم

دکھ کو اپنے، دکھ نہ سمجھیں
اَوروں کے غم کھائیں ہم

امن کا جھنڈا، سب سے اچھا
یہ پرچم لہرائیں، ہم

دیس ہے اپنا جنت، یارو!
جنت سے کیوں جائیں ہم؟

تن من، دھن کو وار کے ناصر
آؤ! پھول کھلائیں ہم

ناصر زیدی، لاہور

دُکھ دے کر

زہرہ ناصر (لاہور)

گرمیوں کی چھٹیوں کے آغاز ہی سے ہم نے تہیہ کر رکھا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے، کچھ ایسا کرنا ہے کہ چھٹیاں بھی مزے سے گزریں اور ہم مشہور بھی ہو جائیں۔ سوچ سوچ کر دماغ تھک گیا کہ ایسا کیا کریں کہ ہم مشہور ہو جائیں۔ دوست احباب، رشتہ دار، محلّہ دار، غرض ہر ایک کی زبان پہ ہمارا نام ہو، ہر گھر میں ہمارا ذکر ہو، کچھ ایسا ہو کہ امی اور دادی کی تمام سہیلیاں، محلّے کی آنٹیاں اور تمام رشتہ دار عورتیں کھانا پکانا بھول جائیں۔ تمام مرد حضرات مع والد گرامی اپنے اپنے کام دھندے چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔

کچھ تو ہو ایسا مگر ہو کیسے؟ گرمیوں کے سخت ترین دن، سکول کا لامتناہی کام، جو کہ عام دنوں میں بھی ہماری نازک طبع پر بھاری تھا۔ یہ تو پھر گرمیوں کے دن تھے۔ امی اور دادی کا ہر کام پر ٹوکنا، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، پڑھ لو۔ وہاں بیٹھ جاؤ، گرمی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ابا جان دفتر سے آتے تو ویسے ہی گرمی سے بوکھلائے ہوتے۔ ایسے میں اگر ہماری کوئی رائی برابر بھی غلطی نظر آجاتی تو آفتوں کے پہاڑ ہماری ننھی جان پر ٹوٹ پڑتے۔ بھائی جان کی اپنی مصروفیت تھی۔ باجی اپنی ڈاکٹری کی پڑھائی میں غرق پائی جاتیں۔ ایسے میں ہم ہی تھے جو کہ کسی بھی ایڈونچر کے منتظر تھے۔ سوچ سوچ کر ہم تھک گئے مگر کوئی بیل بھی منڈھے چڑھتی نظر نہ آرہی تھی۔

پڑھائی میں واہ واہ کروانے کا ہمیں کوئی شوق نہیں تھا اور یہ کوئی ایسا کارہائے نمایاں تو نہ ہوتا کہ سب چولہا ہانڈی بھول جاتے اور مجھے ارجنٹ بیسز پر شہرت درکار تھی۔

وہ صبح بھی عام دنوں کی طرح نہایت تلخ صبح تھی۔ امی کی فصیح و بلیغ ڈانٹ کھا کر ہم نے بستر چھوڑا اور ناشتا کر کے جب باہر آئے تو دادی جان ہاتھ مل مل کر کسی نادیدہ خاندان کو برا بھلا کہہ رہی تھیں اور کسی مظلوم اور معصوم کے حق میں نہ صرف دعائیں کر رہیں تھیں بلکہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں بھی رگڑ رہی تھیں۔

ہم نے تفصیل جاننے کے لیے دادی کی طرف دیکھا تو دادی نے نہایت رقت آمیز لہجہ میں واقعہ کچھ یوں گوش گزار کیا۔

"آئے ہائے کیا بتاؤں معصوم بچہ، اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ماں باپ سے فرمائش کرتا ہو گا مگر آج کل کے ماں باپ کو اپنے فیشنوں سے فرصت ہو تو بچوں کی فکر کریں۔ ہائے ماں صدقے، بے چارہ کس حال میں ہو گا؟" اس ساری گفت و شنید سے لاتعلق میرا زرخیز دماغ تو کچھ اور ہی تانے بانے بن رہا تھا اور اس تانے بانے میں "میں" تھا اور شہرت تھی۔ سارا دن میں نے اپنے متوقع پلان کے ہر پہلو کا تنقیدی جائزہ لیا اور رات کو سکون سے سو گیا۔

سونے سے پہلے میں نے ایک طویل جذباتی خط دادی کے نام لکھا، جس میں بڑے بھائی اور آپا کی بے توجہگی، امی اور ابا جان کی غیر ضروری شکایات اور ٹی وی پر سننے جانے والے بے سروپا جذباتی ڈائیلاگز کی بھرمار تھی۔ وہ خط دادی کے سرہانے رکھ کر ہم مستقبل میں ملنے والی شہرت کے نشے میں جھومتے ہوئے، اذان فجر کے بعد گھر سے غائب ہو گئے۔ غائب ہو جانے تک تو سارا پلان بنا لیا تھا مگر آگے کچھ ٹھیک سے پلاننگ کی نہ تھی۔ منہ اندھیرے چند قدم ہی چلے تھے کہ نادیدہ خوف نے آگھیرا۔ بے اختیار سارا جسم کانپنے لگا۔ ایک دفعہ تو سوچا، جہنم میں جائے ایسی شہرت، گھر چلتے ہیں مگر پھر دل کڑا کر کے آگے چلنے لگے اور اپنے آپ کو غیرت دلائی کہ مردوں کی طرح ہمت نہیں ہارنی۔

اتنے میں دور سے قصور جانے والی بس نظر آئی۔ پہلے تو ہمارا خیال تھا کہ لاہور میں ہی گم رہا جائے پھر بس دیکھ کر دماغ نے رہنمائی کی کہ قصور زیادہ بہتر ہے۔ کم از کم وہاں کوئی جاننے والا تو نہ ہوگا۔ یہ سوچ کر ہم بس میں سوار ہو کر قصور پہنچے۔

وہاں ایک ہوٹل دیکھ کر بھوک چمک اٹھی۔ ہم نے اندر کی راہ لی اور ناشتے کا آڈر دے دیا۔ ایڈونچر کے شوق میں پاکٹ منی کے علاوہ کچھ بچت بھی ساتھ لے لی تھی اور بھائی جان کی جیب پر ہاتھ بھی صاف کیا تھا۔ اس لئے اس وقت جیب میں دو ہزار روپے تھے جو کہ ہمارے خیال میں دو دن کے لئے بہت تھے پھر تو گھر چلے ہی جانا تھا۔ خیر ناشتا آیا تو سامنے کی میز پر موجود صحت مند صاحب جو ہمیں خاصی دیر سے گھور رہے تھے، ہمارے پاس آ بیٹھے اور آنکھیں ہمارے چہرے پر گاڑ کر پوچھنے لگے، گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟

پھر وہ مجھے حیلے بہانے سے ایک کمرے کے دروازے پر لے گیا جس پر موٹا سا تالا تھا۔ اس نے اپنی کمر سے بندھے چابیوں کے گچھے میں سے چابی نکالی، تالا کھول کر مجھے اندر دھکا دے دیا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

دھکا لگنے سے میں زمین پر گرا تو بے اختیار میرا ہاتھ ایک نرم چیز سے ٹکرایا۔ میری چیخ نکل گئی۔ جیسے ہی میں چیخا، مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز قریب سے آنے لگی۔ کمرے میں اندھیرا تھا مگر دروازے کی درزوں اور بند کھڑکی کے درمیان سے جو روشنی آرہی تھی، اس میں میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہاں دس بچے اور بھی تھے۔ دو تو بالکل ہی پانچ چھ سال کے تھے اور باقی کچھ سات آٹھ سال کے اور تین میرے جتنے بھی چودہ تیرہ سال کے۔ وہ نرم چیز جو میرے ہاتھ سے ٹکرائی تھی، وہ اس چھوٹے بچے کا ہاتھ تھا جو رونا شروع ہو گیا تھا۔

اور وہ بار بار کہتا "امی کے پاس جانا، مجھے امی کے پاس جانا۔" یہ منظر میرے جسم سے جان نچوڑنے کو کافی تھا۔ میں ایڈونچر کے شوق میں ایسی جگہ آن پھنسا تھا۔ اب نہ صرف اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا بلکہ یہ سوچ سوچ کر دل بند ہو رہا تھا کہ اب بھی گھر جا بھی

سکوں گا کہ نہیں۔ امی ابو، دادی، بھائی جان اور باجی بار بار یاد آ رہے تھے اور آنسو ایک لڑی کی طرح میرے گالوں کو بھگو رہے تھے۔

آخر دروازہ کھلا۔ ایک آدمی کھانا دے کر چلا گیا۔ سب نے کھانے کی طرف دیکھا اور چپ چاپ بیٹھے رہے۔ آخر کب تک، پیٹ بڑی ظالم چیز ہے۔ کھانا بہت زیادہ تھا اور بہت اچھا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ یہ لوگ کھانا بہت اچھا اس لئے دیتے تھے تا کہ فروخت تک سب بچوں کی صحت اچھی رہے، کوئی بیمار نہ ہو جائے۔

ہمیں اس کمرے میں بند کافی دن گزر گئے۔ اس دوران مجھے پچھتاوے کے احساس نے تقریباً ختم کر دیا تھا۔ وہاں پر تین لڑکے اور میری طرح گھر سے بھاگے ہوئے تھے۔ ایک دن مجرمین کے حکم پر سب نے نہا کر نئے کپڑے پہن لیے تو وہ ہمیں ایک بڑی سی ویگن میں بیٹھا کر ایک نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔ ویگن میں موجود دو آدمیوں نے ہم سب بچوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ اگر کوئی بولا یا رویا یا کسی کی آواز نکلی تو موقع پر ہی گولی مار دی جائے گی، ساتھ ہی اُنہوں نے ہمیں رائفل بھی دکھا دی۔ ہم سب کی زبانیں تو پہلے ہی خوف سے بند تھیں، اب تو رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ دو دن چلنے کے بعد ویگن ایک بڑی عمارت کے سامنے رک گئی۔

آخر وہ ظالم لمحہ بھی آ گیا، جب ہم ایک بحری جہاز میں بیٹھے تھے۔ خوف اور دہشت سے ہمارے دماغ اور زبانیں بند تھیں۔ سفر کئی دن جاری رہا، پھر ہمیں ساحل پر اتارا گیا۔ دراصل یہ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ ہمیں دبئ سمگل کیا گیا تھا۔ دبئ میں دولت سے اندھے کچھ عرب شیخ اونٹ دوڑ میں چھوٹے بچوں کو استعمال کرتے ہیں۔ بچہ اونٹ پر باندھ دیا جاتا ہے۔ اُونٹ کے بھاگنے سے بچہ ڈر کر روتا ہے تو اونٹ اور تیز بھاگتا ہے۔

اچانک سامنے سے چند پولیس مین آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے ہمارے پاس پہنچ کر عربی زبان میں کچھ پوچھا۔ ہمارے ساتھ آئے ایک مرد نے جواب میں عربی میں کچھ کہا۔ ان دونوں میں چند لمحے بات چیت ہوتی رہی۔ پھر وہ ہم سب کو لے کر ایک کمرے میں چلے گئے اور وہاں بیٹھا دیا۔ ہم دس کے دس بچے اسی طرح سہمے ہوئے تھے۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ پولیس ان لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگی۔ پھر ایک عام کپڑوں میں آدمی ہمارے پاس آیا۔ وہ اُردو بول رہا تھا۔ اس نے ہم سب سے پوچھا کہ ہم کون ہیں اور یہ مرد ہمارے کیا لگتے ہیں۔ ہم تین جو کہ بڑے اور قدرے سمجھ دار تھے، اس شش و پنج میں تھے کہ اگر بولے تو مزید کوئی مصیبت نہ نازل ہو جائے۔ پھر یہ الجھن بھی تھی کہ اگر نہ بولے تو موقع نکل جائے گا۔

اس آدمی نے چھوٹے چھ سالہ بچے کو پیار کیا اور کہا کہ بیٹا آپ کی امی کہاں ہیں۔ اس نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور زور زور سے بولنے لگا "امی کے پاس جانا۔"

اتنا سننا تھا کہ ہم سب بھی رونے لگے۔ اس آدمی کا شک یقین میں بدل گیا۔ جب ہم چپ ہوئے تو ان کو سب کچھ بتایا۔ اس آدمی نے ہمیں یقین دلایا کہ آپ کو ہم واپس آپ کے گھر لے کر جائیں گے مگر چند دن ضروری کارروائی میں لگیں گے۔ یہ چند دن ہم نے کیسے کاٹے، آج بھی یاد آتے ہیں تو راتوں کی نیند اُڑ جاتی ہے۔ یقین اور بے یقینی کی کیفیت سے ہم تب نکلے، جب ہم نے پاکستان کے ایئرپورٹ پر قدم رکھا۔ وہاں سے ہمیں ایک آفس میں لے جایا گیا۔ جہاں پولیس کے افسر بھی تھے اور اخبار والے بھی۔

ہماری تصویریں کھینچی جا رہی تھیں اور میرے کانوں میں میری ہی دعائیں گونج رہی تھیں کہ اے اللہ! مجھے شہرت ملے۔ میری تصویر اخبار میں آئے۔ کچھ ایسا ہو کہ امی اور دادی کی سہیلیاں رشتہ دار، محلہ دار، سب عورتیں کھانا پکانا بھول جائیں۔ ابو اور ان کے دوست وغیرہ دفتر بھول جائیں، ہر زبان پر میرا نام ہو۔ یہ سب کا سب سچ ہوا مگر کیسے ہوا۔ محض چودہ سال کی عمر میں مجھے اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کا دل دکھانے اور محض ایڈونچر کے شوق میں شیطانی خیال کو عملی جامہ پہنانے کا ایسا سبق سکھایا کہ میں دوسروں کے لیے مثال بننے کی بجائے عبرت بن گیا۔ اس شہرت نے میرے والدین کو کتنی اذیت دی۔ اس کا تصور بھی روح فرسا ہے۔

آج اس واقعے کو دس سال گزر چکے ہیں۔ میں اب چوبیس سال کا ہوں۔ ہر امتحان کو امتیازی نمبروں سے پاس کر کے میں ایک کامیاب پولیس افسر بننا چاہتا ہوں جو کہ جرائم پیشہ افراد کو ان کے انجام تک پہنچائے مگر میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی خوشی، کامیابی اور شہرت ایسی نہیں جو کہ والدین کو دکھ دے کر ملے۔☆

اعتبار ساجد (لاہور)

"میں بات کروں گا۔۔۔" قربان شاہ نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے چند جن سالانہ خریدار بن جائیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ آسیب اور جن پیسے کے معاملے میں کنجوس ہوتے ہیں۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک جن کو بلا کر حکم دیا تھا کہ وہ کہیں سے مجھے ایک لاکھ روپے کا بندوبست کر دے مگر وہ غائب ہو گیا۔ بذریعہ عمل اسے چار پانچ دن بعد طلب کیا تو کہنے لگا، جنات روپے پیسے سے بے نیاز ہیں۔ اس لئے نہ ان کا کوئی بینک ہے نہ بیلنس۔ جن کے پاس کہیں سے گری پڑی کچھ رقم آگئی ہے تو وہ ادھار دینے کے قابل نہیں، خیرات کے بھی قائل نہیں، عطیات کی پوزیشن میں نہیں۔" قربان شاہ سے مایوس ہو کر جندوڈا میرے پاس آ بیٹھا۔

کہنے لگا۔ "چیمن کے شہزادے! اب میں سوچ رہا ہوں کہ رسالے کا نام ہم نے غلط رکھ دیا ہے۔ اسی لئے شریف شرفاء ہم سے بدکتے ہیں اور کوئی پارٹی پھنسنے پر تیار نہیں ہوتی۔ کیا خیال ہے بدل نہ دیں رسالے کا نام؟"

میں نے کہا۔۔۔ "جندوڈے! میری جان! ہمیشہ سے تمہاری یہ عادت ہے کہ قدم پہلے اٹھا لیتے ہو، سوچتے بعد میں ہو۔ تمہاری اس بدعادت کا خمیازہ واحد دوست ہونے کے ناتے مجھے بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ میں تو پہلے ہی اس آسیب چھپے کے خلاف تھا۔ بہ ہر حال دیر آید درست آید۔ اب اس رسالے کا نام ہو گا ماہ نامہ "شرافت" بلکہ ماہنامہ "شرافت۔" "ڈن۔" جندوڈے نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "میں ابھی بورڈ اتروا کر اس کی عبارت تبدیل کرواتا ہوں۔ براہ کرم بورڈ کی عبارت تیار کرو۔"

میں نے دو تین عبارتیں بنائیں۔ جندوڈے نے ایک عبارت پسند کی جو اس طرح تھی۔

شرفاء کے لئے انتہائی بے ضرر، شریف النفس رسالہ

ماہ نامہ "شرافت"

چیف ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اعلیٰ حضرت جے ڈبلیو خان
(نجیب الطرفین)

ادھر ہم نے "شرافت" کا بورڈ لگایا ادھر ہمارے کرم فرما، ادباء و شعراء کسمسانے لگے۔ مختلف قسم کے اعتراضات ہونے لگے۔ کسی نے کہا، نام غیر ادبی ہے، کسی نے کہا، اس قسم کے رسالے چل نہیں سکتے۔ کسی کو پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ نام پڑھ کر علاقے کی سی آئی ڈی حرکت میں آجائے گی۔ مختلف اندیشے، وسوسے، توہمات اور اعتراضات کا مینہ برسنے لگا۔ آنے جانے والوں میں کمی واقع ہونے لگی۔ انتہا یہ کہ بڑے ادیبوں نے پھر بھی توجہ نہیں فرمائی۔ اور حضرت قربان شاہ نے اپنے ایک ہزار روپے کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ جندوڈا سٹیشنری تیار کروانے سے پہلے پھر شش و پنج میں پڑ

اُردو ہے جس کا نام

ہم اُردو فارسی رسم الخط میں لکھتے ہیں۔ اگر اسی رسم الخط میں ہم پنجابی بھی لکھیں تو اس رسم الخط کو شاہ مکھی کا نام دیا جاتا ہے۔ پنجابی کا دوسرا رسم الخط گر مکھی ہے۔ ہندی زبان دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اُردو کے الفاظ لکھتے اور بولتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ان الفاظ کا تلفظ ان کی اصلی زبان میں کیا ہے کیوں کہ اردو بہت سی زبانوں کا مجموعہ ہے۔

گیا۔ کیوں کہ قربان شاہ نے جس شخص کو وصولی کے لئے بھیجا تھا، وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ اس کا عصا بھی سیاہ تھا اور ٹوپی بھی سیاہ تھی، جب کہ آنکھیں لال تھیں۔ اسے ٹالنے کے بعد جندوڈے نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "غالباً یہ وہی جن ہے جس کے ذریعے شاہ صاحب نے ایک لاکھ روپے کے حصول کا ارادہ کیا تھا۔" "تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔

جندوڈے کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولا۔۔۔۔ "اس لئے کہ یہ شرافت سے واپس چلا گیا۔ اس نے تکرار نہیں کی۔ دوسری بات یہ کہ دروازے سے اندر باقاعدہ داخل ہوا، دھوئیں کی شکل میں ظاہر نہیں ہوا۔ ورنہ عموماً بھرے ہوئے جن قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔"

اگلے دن شاہ صاحب خود آدھمکے۔ ان کے ساتھ وہی مسکین صورت سیاہ پوش جن تھا۔ پہلے تو انہوں نے باہر کھڑے ہو کر گھور گھور کے بورڈ کی عبارت کا جائزہ لیا پھر اس طرح داخل ہوئے گویا تار پر چل رہے ہیں۔ اندر آکر انہوں نے آنکھیں میچ میچ کے ہر شے کو مشکوک انداز میں دیکھا۔ دو تین مرتبہ تالی بجائی۔ پھر اپنے ہمراہی کی ٹوپی اتار کر پیالے کی طرح دونوں ہاتھوں پر اٹھالی۔۔۔۔ اور خاموش کھڑے ہوگئے۔

میں اس وقت نئے لیٹر پیڈ کے سلسلے میں جندوڈے کی دست کاری دیکھ رہا تھا۔ خادم حسین برچھی اپنی میز پر اکڑوں بیٹھا تختہ کتابت سینے سے لگائے مصروف کتابت تھا۔ جندوڈا سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف اچھال رہا تھا۔ اچانک شاہ صاحب کئی فٹ اوپر اچھلے اور "زید کی ٹوپی بکر کے سر" کہتے ہوئے سیاہ پوش کی ٹوپی انہوں نے جندوڈے کے سر پر رکھ دی۔

جندوڈا چنگھاڑ مار کے پرے جا پڑا۔ مارے دہشت کے اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ مونچھیں پھڑ پھڑانے لگیں۔ دل

دوز لہجے میں بولا۔ "جِن کے شہزادے! میرا قصور معاف کریں۔ اللہ میری توبہ۔"

"بہت مشکل ہے۔۔۔" شاہ صاحب نے مسلسل انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے بد عہدی کی ہے، بغیر اجازت رسالے کا نام تبدیل کر لیا ہے۔ کون کہتا ہے آسیب سے اچھی شرافت ہے، میرے سامنے لائیں اسے۔"

جندوڈے نے لرزتے ہاتھوں سے خادم حسین برچھی کی طرف اشارہ کیا۔ شاہ صاحب نے لپک کر برچھی کی گردن دبوچ لی۔ اس کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب لا کر پراسرار لہجے میں بولے۔۔۔ "بول کیا چیز بننا پسند کرے گا، الو، مکھی، چمگادڑ، بلی یا گیدڑ۔۔۔؟" برچھی صاحب کی چیخیں نکل گئیں۔

"سرکولیشن منیجر صاحب!" جندوڈے نے چیخ کر کہا۔ "فوراً بورڈ اتاریں اور اسی وقت اسے پینٹر کے پاس لے جائیں۔ اس پر پرانی عبارت لکھوائیں۔ شاہ صاحب قبلہ سے منظور کروائیں۔ پھر موٹے کیلوں سے دوبارہ اس بورڈ کو اس کے مقام پر فٹ کردیں۔ اسے چیف ایڈیٹر اور قبلہ سرپرست اعلیٰ کا حکم سمجھیں۔"

میں نے خاموشی سے ہتھوڑی اٹھائی اور ایک سٹول لے کر باہر نکل آیا اور بورڈ اکھاڑنے لگا۔ شاہ صاحب نے چیختی ہوئی برچھی کی گردن چھوڑ دی۔ وہ دھپ سے فرش پر جا پڑا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ جندوڈا فوراً چائے کے لئے کینٹین چلا گیا۔

رفتہ رفتہ شاہ صاحب کا موڈ بحال ہوا۔ چائے آئی تو جندوڈے نے خود پیالیوں میں ڈال کر دونوں کو ادب و احترام سے پیش کی اور ان کے آگے بسکٹوں کی پلیٹ بھی سرکائی۔ میں بھی بورڈ اتار کے، چائے نوشی کی اس متبرک محفل میں شریک ہوگیا۔ برچھی بھی اپنی گردن سہلاتا ہوا اٹھ بیٹھا اور کھسکتے کھسکتے شاہ صاحب کے گھٹنوں کے قریب ہوگیا، کہنے لگا۔ "عالی جاہ! میں نے بڑی بڑی عامل کامل ہستیاں دیکھی ہیں لیکن آج آپ کے فن کا لوہا مان گیا ہوں۔ بے شک آپ کے ہاتھوں میں ایسی زبردست طاقت ہے کہ اگر آپ اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کی دم پکڑ لیں تو وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر آپ ہلکا سا دباؤ میری گردن پر ڈال دیتے تو ہڈیاں سرمہ ہو جاتیں مگر قربان جاؤں آپ کی شفقت کے۔ آپ نے ریشم کی طرح میری گردن سہلائی اور انتہائی محبت کے ساتھ زمین پر لٹادیا۔

یہ کمالات کسی کسی میں ہوتے ہیں۔۔۔"

شاہ صاحب نے پیالی ایک طرف رکھی اور برچھی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔ "ماشاء اللہ بہت نیک اور سعادت مند روح پائی ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی تمہیں اپنے حلقہ مریدین میں شامل کر لیا جائے گا۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تمہارے اندر باطنی اوصاف موجود ہیں۔ ایسا خوش اطوار مرید کبھی کبھار ہی ملتا ہے۔" یہ کہہ کر واسکٹ کی جیب سے سیاہ گڑ کی ایک ڈلی نکالی اور اسے دیتے ہوئے بولے۔ "روزانہ رات کو سونے سے پہلے ماچس کی تیلی کے مسالے برابر، ایک ریزہ اس طلسماتی گڑ کا، سادہ پانی کے ساتھ نوش جان کر لیا کرو، چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔"

خادم حسین برچھی نے چوم کر اس پرانے گڑ کی ڈلی اوور کوٹ میں رکھ لی۔

فضا حد درجہ خوش گوار ہو گئی تھی۔ لہٰذا جندوڈے نے بے دھڑک مطالبہ داغ دیا۔ "موتیوں والی سرکار! آپ نے مزید عطیات کا وعدہ کیا تھا۔"

"صمصام بن بصام!" شاہ صاحب نے اپنے ہم راہی کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "سائل ہذا کو شاد باد کر دیا جائے۔"

سیاہ پوش نے فوراً اپنے چغے میں ہاتھ ڈالا اور چند نوٹ شاہ صاحب کی طرف بڑھا دیے۔ شاہ صاحب نے گن کر جندوڈے کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک سو اسی روپے ہیں، کوہ قاف کی پریوں کی طرف سے، امدادی رقم سمجھ کر قبول کیجیے۔"

کوہ قاف کی پریوں کی جانب سے موصول ہونے والی رقم سے ہم نے ہوٹل اللہ مالک کے بقایا جات ادا کیے اور باقی رقم پینٹر کے سپرد کی، جس نے ناک بھوں چڑھا کر بورڈ ہمارے حوالے کیا۔

اب اس بورڈ کی پیشانی پر جے ڈبلیو خان کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حضرت قربان شاہ کا نام بھی بطور سرپرست اعلیٰ چمک رہا تھا۔

جس وقت ہم یہ بورڈ دوبارہ اس کی جگہ پر ٹھونک کر فارغ ہوئے، اسی وقت ایک سیاہ بھجنگ شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے لباس بھی گہرے رنگ کا پہن رکھا تھا اور عینک بھی سیاہ زیب چشم تھی، لہٰذا سر تاپا ایک سیاہ ہیولہ نظر آ رہا تھا۔

اس وقت ہم چائے پی رہے تھے۔ یعنی میں، برچھی اور جندوڈا۔ اندر آ کر وہ بے تکلفی سے ہمارے سروں پر جھک کر کھڑا ہو گیا، بڑی رازداری سے بولا۔"

"میرا نام ہدایت اللہ مقسوم ہے اور میں ڈائریکٹر انفارمیشن کا پی اے ہوں۔"

ہم سب نے کھڑے ہو کر اسے تعظیم دی اور نشست پیش کی۔ کیتلی میں ایک پیالی چائے باقی تھی جو جندوڈے نے اپنے لیے مختص کر رکھی تھی، وہی ہدایت اللہ مقسوم کو پیش کر دی گئی۔ وہ چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "ڈیکلریشن حاصل کیے بغیر آپ کوئی رسالہ نہیں چھاپ سکتے۔ یہ قانوناً جرم ہے۔

بہتر یہ ہو گا کہ یہ بورڈ وغیرہ اتار لیں اور قانون کے مطابق پہلے ڈیکلریشن کی درخواست دیں۔"

"بہ ہر حال۔۔۔"

طویل بحث و مباحثے کے بعد جندوڈے نے اپنا فیصلہ سنایا۔ "بورڈ نہیں اترے گا اور رسالے کے لئے ڈیکلریشن کی درخواست داخل جائے گی۔"

صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر اور ایک پیالی چائے پی کر میں دفتر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جندوڈا دکان کے تھڑے پر چڑھا زور شور سے بورڈ اکھاڑنے میں مصروف ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بورڈ سمیت دھڑام سے نیچے آگرا اور اپنی چوٹیں سہلاتے ہوئے بولا۔ "چمن کے شہزادے! میں تمہارے پاس آنے ہی والا تھا۔ فوراً رکشا پکڑو۔ ہم یہ بورڈ پینٹر کے حوالے کرنے جا رہے ہیں تاکہ وہ اس پر جلد از جلد سیاہ برش پھیر کر عبارت مٹا دے۔۔۔"

"خیریت؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ لپک کر دکان کو تالا لگانے لگا۔ میں نے ایک رکشا رکوایا۔ جب ہم بورڈ سمیت رکشے میں سوار ہو گئے تو جندوڈے نے ہانپتے ہوئے بتایا۔ "اللہ نے ہمیں بچا لیا ورنہ کشتی ڈوب جاتی، تباہیاں بکھر جاتیں، ہماری عزت خاک میں مل جاتی، ہم منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔"

"مگر کیوں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "ایسا کیا قصور ہوا ہم سے؟"

"قربان شاہ فراڈ نکلا۔۔۔" جندوڈا گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولا۔ "ہم اسے عامل، کامل، نجومی اور ماہر عملیات سمجھتے رہے مگر وہ فراڈی سرکار، پولیس کو مطلوب اشتہاری ملزم نکلا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"اسے پولیس نے جن سمیت گرفتار کر لیا ہے۔" جندوڈا کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "آج کے اخبارات نے اس کا کچا چٹھا صاف صاف چھاپ دیا ہے۔ بہت ممکن تھا کہ پولیس ماہ نامہ آسیب کے بورڈ پر اس کا نام پڑھ کے ہمیں بھی تفتیش میں گھسیٹ لیتی۔ پھر کیا ہوتا؟ وہ کم بخت جن بھی اشتہاری ملزم نکلا۔"

میں نے بھی اپنے اور جندوڈے کے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ پینٹر کے پاس پہنچ کر جندوڈے نے سب سے پہلے بورڈ پر سیاہی پھروائی۔ اور قریب سے جھک جھک کر بورڈ کی سطح کا جائزہ لے کر ہدایات دیتا رہا۔ جب ساری عبارت بالکل معدوم ہو گئی تو جندوڈے نے اطمینان کا سانس لیا۔ جیب سے کاغذ کی ایک چٹ نکال کر پینٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "موتیوں والی سرکار! اب اس بورڈ پر یہ عبارت جلی حروف میں بہت خوب صورت تحریر کر دو۔۔۔" پینٹر نے چٹ لے کر ایک نظر عبارت پر ڈالی، ایک نظر ہمیں دیکھا۔ پھر زیر لب مسکرا کر کام میں جت گیا۔ اب اس بورڈ پر ایک نئی عبارت طلوع ہو رہی تھی۔

انجمن اصلاح ادب و معاشرہ

وارڈ نمبر۔210

سیکرٹری جنرل: پروفیسر بی کے بٹالہ

نجیب الطرفین= جس کے ماں باپ دونوں اچھے خاندان سے ہوں۔

1- ہیڈ تریموں کس شہر کے قریب واقع ہے؟
2- آٹھ بازاروں کا شہر کون سا ہے؟
3- یہ فقرات اس رسالے کی مدد سے مکمل کریں اور کہانی بھی بتائیں:
i- ---- لومڑی کی طرح چالاک اور عیار آدمی تھا۔
ii- ---- اس قدر دل چسپ تھا کہ دونوں اس میں محو ہو کر رہ گئے تھے۔
iii- یہ سنتے ہی وہاں کا ---- بھڑک اٹھا۔
iv- ---- صاحب کی چیخیں نکل گئیں۔
4- آم کا آبائی وطن کون سا ہے؟
5- غزوہ بدر میں کتنے اہل حق شریک ہوئے۔
6- تعلیم و تربیت میں کتنے صفحات چار رنگوں کے چھپتے ہیں؟
7- اپنی اُردو آزمائیں۔
i- ساون کے اندھے کو ---- ہی سوجھتا ہے۔
ii- ---- کیا جانے ادرک کا بھاؤ۔
iii- ناچ نہ جانے ---- ٹیڑھا۔
iv- ہر ---- چیز سونا نہیں ہوتی۔
8- کون سا فٹ بالر پچھلی عیسوی صدی میں سب سے زیادہ مشہور ہوا؟
9- تعلیم و تربیت کی ان تحاریر کے قلم کار بتائیں۔
i- لارا کی ٹوپی۔ ii- گرمی اور سند ھوندی۔ iii- ایک دال دو روٹیاں۔
iv- چوزے تمھیں مبارک ہو۔
10- پچھلے برس تعلیم و تربیت میں رابندر ناتھ ٹیگور کی کون سی کہانی چھپی تھی؟
11- شاعر "جون ایلیا" کا اصل نام بتائیں؟
12- پاکستانی کرکٹ ٹیم نے کس کی قیادت میں ورلڈ کپ جیتا تھا؟

جوابات علمی آزمائش مئی 2009ء

1- رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل، جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے (مرزا غالب)
ii- ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ۔ (اقبال)
2- بتائیں (ماہ نامہ آسیب)، فریب کار (پارس پری ہنگامہ)، این او (کفارہ)، بولتے (ننھے پانڈے کی دعا)۔ 3- نذیر انبالوی، علی اکمل تصور، حامد مشہود، جدون ادیب۔ 4- 1961ء 5- جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی 6- جاپانی زبان سے 7- مہر النساء 8- 1901ء 9- دریائے کابل۔ 10- 72- 11- اے علم تجھے سلام 12- کراچی۔ 13- 22 نومبر 1995ء۔ 14- دس۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے تقریباً درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے ان 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔
☆ نبیلہ شیخ، اسلام آباد (200 روپے کی کتب)
☆ محمد عتیق الرحمان اسلم، میر پور کشمیر (175 روپے کی کتب)
☆ جنید نعیم دیوان، حویلی لکھا (125 روپے کی کتب)

مستقل سلسلوں میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام یہ ذریعہ قرعہ اندازی:
☆☆ محمد نثیل سرور سرگودھا۔ زرمینہ ملک کراچی۔ زینب نصرت مانگلا بل۔ صباحت فاطمہ حویلی لکھا۔ ملک عدیل احمد ایبٹ آباد۔ احمد حسن چشتی ڈیرا غازی خان۔ درخشاں ندا جہلم کینٹ۔ محمد زبیر ارشد ملتان۔ یسریٰ تنویر، نمیرہ کامران، آمنہ مہتاب، شانزے طارق، رجا قدیر، تہنیت، حمزہ سعد، راحم، روحان انیس، نبی نذر، علیشہ فاطمہ، سعدیہ حنیف، ثناء توقیر، علی زین، غلام قادر، باسط علی، کراچی۔ عظمت ندیم سیال کوٹ۔ معروفہ جاوید ڈیرا اسماعیل خان، حسن عمر جھنگ۔ تطہیر ظہرا اسلام آباد۔ شباب علی ٹیکسلا۔ انیس الرحمان مشوانی ہری پور ہزارہ۔ راحت ندیم سیال کوٹ۔ شمع منظور راول پنڈی۔ اسامہ وحید کراچی۔ زینب علی جعفری اسلام آباد۔ ہارون الرشید جہلم۔ سلمان منیر کہوٹہ پکا۔ ثقلین علی اسلام آباد۔ دامن زہرا اسلام آباد۔ نبیلہ شیخ اسلام آباد۔ نور فرید، خدیجہ فرید، ولید فرید کراچی۔ خنساء رضوان، موسیٰ عمران، خولہ رضوان، منتہیٰ عمران لاہور۔

ان خاکوں کی مدد سے کہانی اور اس کا عنوان تخلیق کریں اور بیش قیمت انعامات پائیں۔ آپ کی کہانی منفرد اور دل چسپ ہونی چاہیے۔

مجلس مشاورت نے 840 کہانیوں میں سے 100 کہانیاں منتخب کر کے بہ ذریعہ قرعہ اندازی ان بچوں کو انعامات کے حق دار سمجھا ہے:

1۔ الامیرہ سحر، راول پنڈی 200 روپے کی کتب　2۔ سمعیہ غفار، کراچی۔ 175 روپے کتب　3۔ ملک عدیل احمد، ایبٹ آباد 125 روپے کی کتب

چند بہترین تخلیق کار بہ ذریعہ قرعہ اندازی: فارحہ، محمد عقیل، ماورا شاہد، وردہ ندیم کراچی۔ زینب ظفر حسن ابدال۔ کرن شاہین اٹک۔ مریم، زیبی، ندا، درخشاں، ہارون الرشید، محمد عمار بٹ جہلم۔ محمد مقسط نواز جھنگ۔ عبدالاحد فیصل آباد۔ مہوش فاروق سرائے عالم گیر۔ راحت ندیم سیال کوٹ۔ اریبہ سیف چیچہ وطنی۔ شباب علی ٹیکسلا۔ صبا روشن، مسرور حسین لاہور۔ مریم حسنات بگوی، مریم فاروق، دامن زہرا، کرن حسنات بگوی اسلام آباد۔ صلاح الدین راجن پور۔ غلام معین الدین، عروج فاروق گوجرانوالا۔ محمد ضیغم سردار۔ ساوی ناصر ملتان۔ کرن عائشہ، سارہ ثاقب احمد راول پنڈی۔ طیبہ نصرت سانگلاہل۔ فاطمہ کریم پشاور۔ نور فرید، خدیجہ فرید، ولید فرید کراچی۔ خنساء رضوان، موسیٰ عمران، خولہ رضوان، منتہیٰ عمران، حنظلہ شعیب، حذیفہ شعیب لاہور۔ مریم شفیع، خولہ رؤف، احمد حسن، عزیر عبداللہ لاہور۔ سمعیہ اشرف لاہور

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

یہ رسالہ اس پر فتن دور میں ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔
(محمد آصف ریاض، جھنگ)
تعلیم و تربیت روز بروز بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ حسن ذکی کاظمی صاحب کو کوئی ایوارڈ ضرور ملنا چاہیے۔ قصہ نصف صدی کا تو ٹاپ پر رہی۔ کیا نذیر انبالوی صاحب کا مشہور قلم کار "وقار انبالوی" سے کوئی رشتہ ہے؟ (دامن زہرہ، اسلام آباد)
☆وہ ان کے ننھیال کے رشتہ دار تھے۔
میں اسے پچھلے تین سال سے پڑھ رہا ہوں۔ (ذوالقرنین شاہد، بھوآنا)
آپ کا نام کیا ہے۔ (ذیشان خان، لیہ)
☆☆مدیر اعلیٰ محترم عبدالسلام، مدیر محترم ظہیر اسلام، معاون مدیر حامد مشہود۔
تعلیم و تربیت بہت ہی پیارا ہے۔ (مہوش چودھری، میرپور آزاد کشمیر)
مجھے تعلیم و تربیت بہت زیادہ پسند ہے۔ (نازیہ مقصود، ننکانہ صاحب)
تعلیم و تربیت وطن عزیز میں اُردو اور اُردو ادب کو پروان چڑھا رہا ہے۔
(شیلا ثاقب ڈار، لائبہ ثاقب ڈار، گوجرانوالا)
میں تقریباً پانچ سال سے آپ کا رسالہ پڑھ رہا ہوں۔ (اسامہ زبیر، اسلام آباد)
ثاقب رحیم الدین کی کہانی ننھے پانڈے کی دعا بہت اچھی تھی۔ (عدیل اصغر، بہاول پور)
انعامات میں کون سی کتابیں دی جاتی ہیں؟ (عبدالباسط، ڈیرہ)
☆☆☆مختلف کتب۔
کیا آپ احمد سلیمان، یونان کا نمبر یا ایڈریس بتا سکتے ہیں، قلمی دوستی کے لیے؟
(علی حیدر، کوٹ ادو)
☆☆☆جوابی لفافہ ارسال کریں۔
رسالہ بہت اچھا ہے (عبدالرزاق سندھو، مزمل اور یس، ملتان)
آپ سب کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنے بیگ میں فیروز اللغات اُردو (جدید) رکھا کریں، چاہے چھوٹی کیوں نہ ہو، بہت مفید ہے۔ کیا وہ سچ تھا جو مدیر نے آسٹریلوی لڑکے کے بارے میں بتایا تھا؟ (زیب النساء، لاہور)
☆☆☆ہاں! تو اور کیا۔
آپ پاکستان کے جنگلات کے بارے میں ضرور کچھ لکھیں۔
(محمد جعفر، گروٹ خوشاب)
کیا ہمارا قومی جانور "مارخور" ہے۔ (سیدہ کسا نقوی، لاہور)
☆☆☆ہاں شور تو یہی مچا ہوا ہے۔
میرے نانا "جلیل نقوی" صاحب اپنے بچپن سے تعلیم و تربیت کے قاری بھی رہے ہیں اور اس میں لکھتے بھی رہے ہیں۔ ان کے زمانے کے تعلیم و تربیت کے رسالے ان کی لائبریری میں محفوظ ہیں جو میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ (زینب علی جعفری، اسلام آباد)
"ماں تجھے سلام" پڑھ کر واقعی دل میں ماں کی محبت نے جوش مارا۔
(عائشہ وحید، کراچی)
اُردو کے حوالے سے معلومات فراہم کرنے کا بہت بہت شکریہ۔
(ثناء صابر، جہلم)
تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ (یمنیٰ افتخار)
"میری پسند" اشعار کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں (نازش توقیر، موگا)
ماں تجھے سلام اور آدھے مزدور اچھی لگی۔ (سارہ شریف وڑائچ، سرگودھا)
پارس پری ہنگامہ میں اس کا کیا مطلب تھا "کچھو کچا کرا لوں گا۔"
(محمد سعد، اسلام آباد)
☆☆☆کردار کا مستقل مکالمہ ہے۔
میں تعلیم و تربیت کا انتخاب کرنے پر مطمئن ہوں۔ (سلمیٰ عفی، یمن)
"زور" پڑھ کر میرے دل میں دہشت گردی کے لئے نفرت مزید بڑھ گئی ہے۔
(محمد عماد بٹ، چک جہاں)
"نذیر انبالوی" اور "اعتبار ساجد" کی تصاویر شائع کریں۔ (عاطف فراز، تلہ گنگ)
☆☆☆آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔
سرورق دیکھ کر تو ہم نے پانی کے دو تین گلاس پی لیے۔
(ثاقب نواز، اسد بابر، لاہور)
ہم سب "بچہ ٹولی" کی ایک فرمائش ہے کہ جون کا شمارہ بے حد چٹ پٹا ہونا چاہیے۔ (شمش شکیل اقبال، سیال کوٹ)
اتنی اچھی کہانیاں آپ لاتے کہاں سے ہیں؟ (سید احمد حسن، فیصل آباد)
☆☆☆بہت دور دور سے۔
میں نے اتنے مزے کا عنوان بھیجا لیکن آپ نے شائع نہیں کیا۔ (گل فام)
دنیا میں انسان بہت ہیں مگر "حضور پاک" جیسا کوئی نہیں۔ پھل بہت ہیں مگر "آم" جیسا کوئی نہیں۔ رسالے تو بہت ہیں مگر "تعلیم و تربیت" جیسا کوئی نہیں۔
(سمیر انصاری، اسلام آباد)
کبھی اوکاڑا سے گزر ہو تو بنگلہ گوگیرا کے گاؤں ٹھٹھا سیداں میں ضرور آیے گا۔
(جویریہ سید، بنگلہ گوگیرا)
☆☆☆ضرور آئیں گے۔
سب بچوں کو آپ کا رسالہ بہت اچھا لگتا ہے۔ (ثنا ندیم، کراچی)
ہم محترم شکیل ردولوی کے بہت بڑے فین ہیں۔
(درخشاں، ندا، مریم، ذیلی، جہلم)
"زور" کہانی مجھے بہت پسند آئی۔ (محمد اویس مصطفوی، اسلام آباد)
میری امی اور میرے ماموں 1965ء سے باقاعدگی سے تعلیم و تربیت پڑھ رہے ہیں۔ (مریم فاطمہ، اسلام آباد)
میں اس سال تعلیم و تربیت ماہ اپریل نہیں خرید سکا۔ (عمیر حنیف، گوجر خان)
☆☆☆ہمارے سرکولیشن آفیسر سے بات کر لیں۔
تعلیم و تربیت! آئی لو یو۔ (طاہر اجلال حسین شاہ، سمندری)
"تحقیق کار بنیے" میں لکھی جانے والی کہانیوں کے لیے الفاظ کی کوئی حد مقرر ہے یا نہیں؟ (زینب ظفر، آمنہ ظفر، حسن ابدال)
☆☆☆بالکل بھی نہیں۔

میں آپ کی سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں۔ (حبیبہ سلامت، لاہور)

☆☆ہمارے سرکولیشن آفیسر کے نام 500 روپے کا منی آرڈر بھیج دیں۔

"قصہ نصف صدی کا" کی دوسری قسط کا میں نے بے چینی سے انتظار کیا۔

(ریحہ حسن، راول پنڈی)

میری امی مجھے کہتی ہیں کہ تم بلاوجہ ہی خط بھیجتے ہو چھپتا تو ہے نہیں۔

(ذیشان حیدر، ڈیرہ اسماعیل خان)

ہمارے پیارے بھرے خطوط اور کہانیاں ردی کی ٹوکری کو ہڑپ کرنے مت دیا کریں۔ (رابعہ زینب، اٹک)

☆☆ردی کی ٹوکری ہمارے پاس موجود ہی نہیں۔

پانچ سال سے آپ کا رسالہ پڑھ رہا ہوں۔ (راحت ندیم، سیال کوٹ)

کیا آپ سے میری ملاقات ہو سکتی ہے۔ (محمد ممتاز احمد، چکی شیخ جی)

☆☆ہاں فون کال پر وقت طے کر کے۔

اس میں زیادہ خوف ناک کہانیاں چھاپا کریں۔ (رابعہ حامد، لاہور)

آپ کا شمارہ نہایت شان دار ہے۔ (سمیعہ تنویر، عائشہ تنویر، راول پنڈی)

یہ رسالہ ہر مہینے ہمارے گھر میں بہت دل سے پڑھا جاتا ہے۔ (سدرہ جمیل، لاہور)

میں تقریباً پچھلے سات سے "تعلیم و تربیت" کا قاری ہوں۔

(محمد بشیر بلبل، چشمہ بیراج)

لفظ توتے کو کیسے لکھا جاتا ہے؟ (سنبل صغیر، فیصل آباد)

☆☆مئی کا شمارہ پڑھ لیں۔

اس ہوا باز کا نام بتائیں جس نے پانچ منٹ میں دشمن کے پانچ جہاز تباہ کیے۔

(اعجاز الحق، کندیاں)

☆☆ایم ایم عالم۔

توتے کے بارے میں آپ نے جو اصلاح کی ہے، وہ بالکل درست ہے۔ عید میلادالنبیؐ کے بارے میں آپ نے ابھی تک وضاحت نہیں کی۔

(سیدہ زہرہ جمال، کراچی)

☆☆وضاحت تیار ہے، مناسب وقت پر پیش کی جائے گی۔

میں اس رسالے کا تین سال سے قاری ہوں۔ (عبدالرحمان خان، جوہر آباد)

تیری کہانیاں ہیں کنول تیری نظمیں ہیں گلاب
تیری روشنی کا نہیں اس دنیا میں کہیں جواب

(نازیہ نذیر، قصور)

ہمارے خط کو اپنی خون خوار اور خوف ناک ٹوکری کی نظر نہ کیجیے گا۔

(طلحہ مشتاق، حمزہ شعیب، اویس ننکانہ صاحب)

میں دوسری کلاس میں پڑھتا ہوں اور مجھے ماما پاپا کہانیاں پڑھ کر سناتے ہیں۔

(عبداللہ ساجد، اوکاڑا)

میں آپ کا رسالہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ ماں تجھے سلام جیسی کہانیاں شائع کریں۔ (اسماء اطہر، لاہور)

آپ میرے ننھے جذبات کی قدر کرتے ہوئے مجھے انعام ضرور دیجیے گا اور میری تحریر بھی شائع کر دیجیے گا۔ (سید منظر بلال حسین شاہ کرمانی، سمندری)

تعلیم و تربیت بہت اچھا ہے میں اسے 2001 سے پڑھ رہی ہوں۔

(مریم عنایت، آزاد کشمیر)

ویسے اس دفعہ کا شمارہ بھی دل چسپ تھا (فواد انصاری، اسلام آباد)

نقش قدم نبیؐ کے ہیں جنت کے راستے
اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

(طاہرہ سرور، جوہر آباد)

پہلی بار ہی رسالہ پڑھا اور پہلی بار ہی خط لکھ ڈالا۔ (اشرف ایوب)

مئی کے شمارے کی ساری کہانیاں تعریف کے قابل ہیں۔ تعلیم و تربیت ترقی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ (ربیعہ حبیب، واہ کینٹ)

مئی کا اداریہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ (سید شباب علی، ٹیکسلا)

تمام خطوط ردی کی ٹوکری سے محفوظ رکھیں۔ "وزارت ایڈیٹر، حکومت قارئین"

(عاطف فراز، تلہ گنگ)

سانحہ لبرٹی لاہور کا سن اور دیکھ کر نہایت افسوس ہوا۔ میں ہی نہیں بلکہ پوری قوم شدید غم میں مبتلا ہے۔ مجھے شدید جھٹکا لگا، جب میں نے یہ خبر سنی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ مسلمانوں کی دین سے دوری ہے۔ جب مسلمان قائد اعظم کے قول: ایمان، اتحاد، تنظیم، کا دامن نہیں پکڑیں گے اور تمام تعصبات بھلا کر ایک نہیں ہو جائیں گے۔ تب تک اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کی امید بے وقوفی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حاسدوں کے حسد، شریروں کے شر سے پناہ دے۔ آمین۔ باقی تعلیم و تربیت کے بارے میں کہنا چاہوں گا کہ یہ ہماری بہت اچھی تعلیم کا ذریعہ ہے۔ (محمد تیمور، محمد فرخ حیات، پیر محل)

میرا خیال ہے کہ میرے اندر خدا نے کچھ تخلیقی صلاحیتیں رکھی ہیں جو کہ آپ کی راہ نمائی سے نکھر کے سامنے آئیں گی۔ (طیبہ طاہرہ)

میں نے آٹھویں کلاس کے بورڈ کے پیپروں میں 497 نمبر حاصل کر کے اپنے سکول میں اوّل پوزیشن حاصل کی ہے۔ (عاقب رباب، چکوال)

☆☆مبارک ہو آپ کو۔

مجھے درس قرآن اور دماغ لڑاؤ بڑا اچھا لگا۔ میں تعلیم و تربیت دو سال سے پڑھ رہا ہوں۔ (گم نام خط)

اس بار تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ میں نظم "کمزوری" بھیج رہا ہوں۔ اس بار میری نظم شائع کر دیجیے۔ (محمد شہزاد مسلم، چشتیاں)

میں پچھلے تین سال سے یہ رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ روز دھماکے ہوتے ہیں، ہمیں سکول جانے میں بڑا ڈر لگتا ہے۔ میں روز نماز میں دعا مانگتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک اور میرے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کو سلامت اور امن میں رکھے۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ آپ "تعلیم و تربیت" کے ذریعے میرے سب دوستوں کو کہیں کہ وہ ہمارے پیارے شہر ڈیرہ اسماعیل خان میں امن کے لیے دعا کریں۔ ایک دفعہ پھر "ڈیرہ پھلاں دا سہرا" بن جائے۔

(اریبہ نصیر، ڈیرہ اسماعیل خان)

میں آپ کا رسالہ بڑے شوق سے پڑھتی ہوں، صرف میں ہی نہیں بلکہ میرے گھر کے سارے افراد بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ (ماریہ نور الصباح، پشاور)

مئی کا رسالہ مجھے 29 اپریل کو ہی مل گیا، میں اسے پا کر بہت خوش ہوئی۔ ہر ماہ کا رسالہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ ہمارے گھر میں یہ رسالہ تقریباً دس سال سے پڑھا جاتا ہے۔ میرے پاس 2005ء سے لے کر 2008ء تک کے شمارے موجود ہیں۔ (حمنہ، فصیحہ اشرف مریدکے)

یہ خطوط سینکڑوں خطوط میں سے بذریعہ قرعہ اندازی منتخب کیے گئے ہیں۔ تمام خطوط شائع کرنا ممکن نہیں۔ امید ہے کہ بچے ہماری مجبوری سمجھ کر اپنی محبت پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک سو ساٹھ ای میل پیغامات بھی موصول ہوئے۔ شکریہ۔

زین اور رباب کی کزن زینب پاکستان میں چھٹیاں گزار کر واپس لندن جا رہی تھی۔ روانہ ہوتے وقت وہ بابا جان اور نانی سے رخصت ہونے ان کے کمرے میں آئی۔ وہ روانہ ہونے لگی تو بابا جان اور نانی نے اسے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ ”اللہ تعالیٰ تمہیں خیریت سے لے جائے۔ وہاں سکھ چین سے رہو۔ خوب پڑھ لکھ کر واپس آؤ۔ اچھی سے اچھی زندگی گزارو۔ خوش رہو، آباد رہو۔“

اور پھر نانی نے زینب کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا ”لو اب سدھارو۔ تمہیں اللہ کی امان میں دیا اور بیٹا وہاں پہنچتے ہی خیریت سے پہنچنے کا تار دے دینا، دھیان لگا رہے گا۔“

زینب نے ذرا چونک کر کہا ”نانی! میں سمجھی نہیں۔ کیسا تار؟“

زین اور رباب بھی کچھ حیران تھے۔ بابا جان زور سے ہنسے ”ہاہاہا۔۔۔ ارے بیوی بالکل ہی سٹھیا گئی ہو۔ تار دے دینا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ تم نے سوچا بھی کہ کس زمانے کی بات کر رہی ہو۔ آج کل بھلا کون تار دیتا ہے؟ ٹیلی فون موبائل، ٹیکسٹنگ، کمپیوٹر، ای میل۔۔۔ یہ سب چھوڑ کر کون جائے گا ڈاک خانے یا ٹیلی گراف آفس، ٹیلی گرام یا تار دینے۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔“

نانی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولیں۔ ”بھئی یہ باتیں تو مجھے بھی معلوم ہیں لیکن کیا کروں، وہ کم بخت زبان پر چڑھا ہوا ہے کہ چلتے وقت تاکید کرتے تھے کہ دیکھو پہنچتے ہی خط لکھنا یا تار دینا۔“

بابا جان نے گردن ہلائی اور بولے ”ہاں یہ تو ہے نہ پرانی عادتیں چھوٹتی ہیں اور نہ پرانی باتیں بھولتی ہیں۔“

نانی نے نواسہ نواسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”لو بھئی تمہارے بابا جان تو کھو گئے پرانی یادوں میں، تم زینب کو تو رخصت کرو۔ کہیں اسے ائیر پورٹ جانے میں دیر نہ ہو جائے۔“

ائیر پورٹ سے واپس آ کر نواسہ نواسی بابا جان کے پاس آگئے اور آتے ہی سوال کیا ”ہاں بابا جان! تو آپ اور نانی تار اور خط کی بات کر رہے تھے اس وقت، تو بتایئے وہ کیا سلسلہ تھا؟“

بابا جان بولے ”ارے بیٹے بات یہ ہے کہ اس زمانے میں لوگوں سے رابطے کا اور کوئی ذریعہ تو تھا نہیں، ٹیلی فون بھی بہت کم تھے۔ ایک دوسرے کا حال جاننے کے لئے بس خط وکتابت ہوتی تھی۔

حال احوال لمبا ہوا تو کئی کئی صفحات کا خط لکھ کر ڈاک کے لفافے میں بند کیا اور اس پر پتا لکھ کر ڈاک خانے میں یا سڑک پر لگے کسی لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ بات تھوڑی ہوئی تو دو پیسے کا پوسٹ کارڈ خریدا اور اس پر حال لکھ کر ڈاک کے حوالے کیا۔ کئی کئی دن لگ جاتے تھے، خط ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے میں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا جتنا فاصلہ ہوتا، اتنا ہی وقت لگتا تھا۔ یہ ڈاک ایک شہر سے دوسرے شہر میں ریل گاڑی کے ذریعے جاتی تھی اور

اس سے بھی پہلے گھوڑا گاڑی کے ذریعے اور دوسرے ملکوں میں پانی کے جہازوں سے ڈاک آتی جاتی تھی۔ بعد میں جب ہوائی جہاز عام ہو گئے تو ہمارے خطوط ہوائی جہاز کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے آنے لگے۔ لیکن پھر بھی انہیں چھانٹنے اور تقسیم کرنے میں دو تین دن کا وقت تو لگ ہی جاتا تھا۔"

نانی بھی بابا جان کی بات غور سے سن رہی تھیں۔ بیچ میں بولیں۔ "اب تو خطوں کا سلسلہ ہی بند ہوتا جا رہا ہے۔ ایک تو لوگ اپنی مصروفیت کی وجہ سے خط لکھنے سے جی چرانے لگے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب ٹیلی فون ٹیکسٹنگ (Texting) اور ای میل جیسی سہولتیں قدم قدم پر میسر ہوں تو بھلا کون بیٹھ کر کئی کئی صفحے کالے کرے گا۔"

بابا جان ہنسے اور کہنے لگے "یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو بیوی! لیکن یہ بات تم بھی مانو گی کہ جو مزہ خط وکتابت میں تھا وہ کسی اور چیز میں نہیں۔ کیسا انتظار رہتا تھا پوسٹ مین کا۔ فلاں عزیز کی خیریت بہت دن سے نہیں معلوم ہوئی، فلاں دوست کا حال مہینوں سے پتا نہیں چلا۔ ایک ایک دن گنا جاتا تھا۔ اور جب خاکی وردی پہنے، سر پر پگڑی جمائے، ڈاک کا تھیلا کندھے سے لٹکائے اور خطوط کی ایک گڈی ہاتھ میں تھامے، ڈاکیا اپنے محلے گلی میں نظر آتا تو دل میں یہ آرزو مچلتی تھی کہ وہ ہمارے بھی کئی خط لایا ہو۔ خطوں سے کیسی خوشی ہوتی تھی۔"

یہ موضوع نانی کی پسند کا تھا۔ مسکرا کر بولیں "ارے خط بھی تو ایسے ہوتے تھے کہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجائے، مکمل حال معلوم ہو جائے۔ بعض خط اس زمانے کی تاریخ کا حصہ نہ سہی لیکن خاندان کی تاریخ کا حصہ ضرور ہوتے تھے۔ انہیں سنبھال کر رکھا جاتا تھا اور اکثر ضروری حوالوں کے لئے انہیں بار بار نکال کر پڑھا جاتا تھا۔ وہ جو میرے پاس نانا ابا کے خط اپنی بہنوں کے نام ہیں اور جو خط آپ کے دادا ابا کے رکھے ہیں، میں اکثر انہیں نکال کر پڑھتی ہوں اور دیر تک مزے لیتی ہوں۔ خاندان کے حالات، محلے والوں کی باتیں، مہمانوں کا آنا جانا، بستی والوں کے قصے، شہر کے حالات۔"

رباب دل چسپی لیتے ہوئے بولی "نانی! ہم نے سنا ہے کہ ہمارے پر نانا یعنی آپ کے ابو بھی بہت خط لکھتے تھے۔"

بابا جان زور سے ہنسے اور بولے "ہاہاہا۔۔۔ رباب بیٹی! خوب یاد دلایا تم نے۔ ارے حیدر ماموں تو کمال کے آدمی تھے۔ کیا عزیز، کیا دوست، کیا دفتری ساتھی۔ کوئی ایسا نہ ہوگا جس کے پاس ان کا خط نہ پہنچتا ہو۔ لکھتے پوسٹ کارڈ پر تھے لیکن اتنا باریک کہ ایک پوسٹ کارڈ میں مضمون کا پورا سمندر سما جاتا تھا۔ ہاہاہا۔۔۔ بعض وقت تو پڑھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ لیکن انداز بھی دل چسپ ہوتا تھا اور حالات کی پوری رپورٹ ہوتی تھی۔ ایک مزے کی بات سنو۔۔۔ حیدر ماموں کے ایک دوست تھے، ماسٹر حامد حسین۔ وہ نزدیک ہی رہتے تھے لیکن ان کی رہائش ایک بڑی سی عمارت کی چوتھی منزل پر تھی۔ ایک زمانہ میں وہ بیمار ہو گئے اور گھر آنا جانا بند کر دیا۔ ادھر حیدر ماموں بھی چوتھی منزل تک زینے چڑھتے ہوئے گھبراتے تھے۔ ٹیلی فون دونوں کے پاس نہ تھا۔ بس یہ سلسلہ شروع ہوا کہ ایک دن حیدر ماموں پوسٹ کارڈ میں دنیا جہان کی باتیں لکھ کر ماسٹر صاحب کے پتے پر بھیجتے اور دوسرے

ڈاکیا

خط بردار کبوتر

ماسٹر صاحب جواب میں ایک خط بھیج دیتے۔ اس طرح دونوں دوستوں کو ایک دوسرے کی خیریت اور حالات معلوم ہو جاتے اور وہ آنے جانے اور زینے چڑھنے کی تکلیف سے بچے رہتے۔ البتہ کم بختی بے چارے پوسٹ مین کی آتی تھی روز ماموں کا خط پہنچانے کے لئے چوتھی منزل تک زینہ ناپنے کی ورزش کرنا پڑتی۔۔۔ ہاہا۔۔۔ بھئی کیا ترکیب نکالی تھی حیدر ماموں نے۔"

نانی بولیں "بچو! ایک بات اور ہے۔ ہمارے زمانے میں خط لکھنا بھی ایک فن تھا۔ دل چسپ اور معلوماتی خطوط جنہیں پڑھ کر مزہ آتا تھا۔ بہت سے ادیبوں اور شاعروں مثلاً مرزا غالب اور سرسید احمد خاں وغیرہ نے تو اس فن میں ایسی شہرت پائی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔ غالب نے جو خط دوستوں عزیزوں کے نام لکھے ہیں، انہیں آج پڑھو تو اس زمانے کی دلی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اس زمانے کی تہذیب، رہن سہن، زبان، رسم ورواج وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح دوسرے ادیبوں شاعروں کے خطوط ان کے زمانے اور شہروں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔"

سرسید احمد خان

خط

میرزا غالب

رباب کہنے لگی "سنا ہے پہلے کبوتر کے ذریعے خط بھیجے جاتے تھے مگر نہ بابا جان نے بتایا اور نہ نانی نے ہی ان کا ذکر کیا۔"

بابا جان ہنسے "ہاہاہا۔۔۔ ارے پگلی! ہم اپنے زمانے کی باتیں کریں گے یا پتھر اور غاروں کے زمانے کی؟ کل تم یہ کہو گی کہ بادا آدم کے زمانے کی بات کیجیے۔ کبوتر کے ذریعے خط بھیجنے کی بات تو ہم سے بہت پہلے کی ہے۔ خیر چلو اتنا بتائے دیتے ہیں کہ کبوتر کو چوں کہ سمت اور فاصلے کا بہت صحیح اندازہ ہوتا ہے لہذا پرانے زمانے میں کچھ کبوتروں کو پیغام رسانی کے لئے باقاعدہ سدھایا جاتا تھا یعنی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ خط کبوتر کے پنجے میں باندھ کر اسے اس سمت میں اڑا دیا جاتا تھا، جہاں جانے کی اسے تربیت دی گئی تھی۔ بس وہ ٹھیک ٹھیک منزل پر پہنچ جاتا تھا اور وہاں اس کے پنجے سے خط کھول لیا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے میرے کاغذات میں کہیں ایک مضمون کبوتروں کے خط لے جانے کے بارے میں رکھا ہے، تلاش کروں گا۔ اگر مل گیا تو کسی دن تمھیں بتاؤں گا۔ اس وقت تو بس یہی یاد ہے کہ تین چار صدی پہلے نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ یورپ وغیرہ میں بھی کبوتر سے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔"

زین کہنے لگا "اور وہ نانی جو تار کی بات کر رہی تھیں؟"

بابا جان نے جلدی سے جواب دیا "ہاں ہاں۔۔۔ وہ ٹیلی گرام۔۔۔ دراصل یہ ایک مختصر بلکہ بہت مختصر پیغام ہوتا تھا جو ٹیلی گرافی کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ یعنی ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک بھیجا جاتا تھا۔ اس میں بجلی کے تار بھی استعمال ہوتے تھے اور وائرلیس بھی۔ یہ سلسلہ ۱۷۷۴ء میں Claude Chappe نے شروع کیا اور مختلف سائنس داں اسے بہتر بناتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۴ء میں Samuel Morse نامی ایک سائنس داں نے الیکٹرومیگنٹ کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ پیغام بھیجنے کا اجازت نامہ حاصل کیا۔ یہ پیغام نہ آواز کے ذریعے جاتا تھا اور نہ تحریر کے ذریعے۔ بلکہ یوں ہوتا تھا کہ میں نے ایک فارم پر اس آدمی کا پتا لکھا جسے پیغام بھیجنا ہے۔ پھر بہت مختصر یعنی چند لفظوں میں پیغام لکھا اور نیچے اپنا نام لکھ دیا۔ ٹیلی گراف آفس والے اسے

حسن ذکی کاظمی عرصہ ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے اور ریڈیو کے سلسلے میں ہی بی بی سی لندن میں ملازم رہے۔ وہ ایک بہت اچھے انسان اور اعلیٰ درجے کے قلم کار ہیں۔

الیکٹرومیگنٹ سسٹم کے ذریعے ایک Key کو ہاتھ سے دبا دبا کر اور کھٹ کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کر کے دوسری جگہ پہنچاتے تھے۔ ہمارے لئے تو یہ کھٹ کھٹ کی آواز ہوئی تھی لیکن دوسری طرف بیٹھے ہوئے شخص کی سمجھ میں یہ پیغام آجاتا تھا اور وہ اسے ایک فارم پر لکھ کر اس کے پتے پر بھیج دیتا تھا۔ اس کھٹ کھٹ کی آواز سے جو پیغام رسانی ہوتی تھی۔ اسے سیموئیل مورس کے نام پر Morse Coding کہا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ بالکل ختم تو نہیں ہوا لیکن اب ٹیلی فون کی فراوانی اور کمپیوٹر کی آسانی کے بعد بس دم توڑ رہا ہے۔ جس طرح خطوں کا سلسلہ اس نئے دور میں کم ہو رہا ہے، تار کا سلسلہ تو ختم ہی سمجھو۔''

نانی بولیں ''چلو اچھا ہی ہوا۔ بھئی ہمیں تو بہت ڈر لگتا تھا ٹیلی گرام آنے سے۔''

زین نے حیران ہو کر پوچھا ''کیوں نانی اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی؟''

نانی ہنس کر بولیں ''ارے بیٹا! کیا بتاؤں۔ یوں سمجھو کہ تار عام طور پر ایمرجنسی یا ارجنسی میں بھیجا جاتا ہے۔ ویسے تو خوشی کی خبر بھی ہو سکتی تھی، کسی کے آنے کی اطلاع بھی ہو سکتی تھی لیکن زیادہ تر بری خبر ہی ہوتی تھی۔ کسی کی شدید بیماری کی خبر یا پھر مرنے کی بدخبری۔۔۔ ادھر تار لانے والا باہر سے آواز لگاتا تھا، تار آیا ہے اور اُدھر گھر والوں کے دل دھک دھک کرنے لگتے تھے کہ لو بھئی آئی کوئی بری خبر۔''

بابا جان کو ایک دم کچھ خیال آیا۔ چونک کر بولے ''ارے زین بہادر! تم اور رباب ہمیں بہت طعنے دیتے ہو کہ ہم ہر وقت پرانے زمانے اور پرانے رسم ورواج کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے، میں نے کچھ لوگوں یا ایک کمیونٹی کے بارے میں پڑھا جو امریکا میں پن سلوانیا کی لنکاسٹر کاؤنٹی میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ آمش (Amish) کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنے پرانے رہن سہن اور رسم ورواج کو چھوڑنے اور نئی باتیں اپنانے پر ہرگز تیار نہیں۔ مثلاً یہ دیکھو کہ اس ترقی یافتہ دور میں وہ بجلی استعمال نہیں کرتے۔ سواری کے لئے گھوڑا گاڑی سے کام لیتے ہیں۔ بہت سادہ لباس پہنتے ہیں۔ غیر شادی شدہ لڑکیاں کالا ایپرن پہنتی ہیں اور شادی شدہ لڑکیوں کی پہچان سفید ایپرن ہوتا ہے۔

Amish مرد ڈاڑھی رکھتے ہیں لیکن مونچھیں نہیں رکھتے۔ لمبی ڈاڑھی مرد کی شان سمجھی جاتی ہے۔ مونچھ صرف فوجی سپاہی رکھتے ہیں۔

بچوں کے لئے بس ایک کمرے کا سکول ہوتا ہے۔

بچے شام کو جلدی سوتے اور صبح جلدی جاگتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں میل جول کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور ایک دوسرے کی دل کھول کر مدد کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ رہ کر اپنی کمیونٹی کو مضبوط کرتے ہیں۔

ان لوگوں میں فوٹو اتارنا منع ہے۔ یہ لوگ بچوں کے لئے جو گڑیاں بناتے ہیں، ان کا چہرہ بھی صاف نہیں بناتے۔ آمش لوگ عبادت تو کرتے ہیں لیکن ہر دوسرے ہفتے۔ یہ عبادت کسی ایک کے گھر میں ہوتی ہے اور پھر دو ہفتے چھٹی۔

اس کمیونٹی میں جب کوئی مرتا ہے تو اس کے مردہ جسم کو ایک سادہ سے تابوت میں رکھ کر تین دن بعد دفن کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ پن سلوانیا ڈچ زبان بولتے ہیں اور ۱۹۶۰ء کے بعد سے اب تک ان کی آبادی تین گنا ہو چکی ہے۔

کیوں بھئی زین اور رباب سنا تم نے؟ تو ایسے لوگ بھی رہتے ہیں آج اس دنیا میں۔۔۔ اب تو اپنے بابا جان کو اپنی تہذیب اور رسم ورواج سے محبت کا طعنہ نہیں دو گے؟''

زین بولا ''بابا جان! مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ آپ اس دنیا کی نہیں، کسی اور سیارے کی مخلوق کی بات کر رہے تھے۔''

بابا جان نے قہقہہ لگایا ''ہاہاہا۔۔۔ چلو تم اس خیال سے خوش ہو تو ایسا ہی سہی۔ لو نانی تو سو گئیں۔ ذرا ان کے خراٹے تو ریکارڈ کر لو، بہت میوزیکل ہیں، ہاہاہا۔''

محمد جاوید چغتائی

آپ بھی لکھیے

بے جا ضد

(سائرہ غفار، کراچی)

"پاپا، پاپا مجھے وہ گلابی ڈیا چاہیے۔" رابعہ نے ضد کرتے ہوئے اپنے پاپا کو مخاطب کیا۔ "مگر بیٹا! ابھی تین چار روز پہلے ہی تو آپ نے نئی ڈیا خریدی تھی ناں وہ باربی ڈول والی۔" پاپا نے نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں لی تھی مگر اب مجھے یہی والی ڈیا چاہیے، آپ کو پتا ہے اس میں پیانو بھی ہے۔ پلیز پاپا لے دیجئے ناں پلیز۔" رابعہ نے زور دیتے ہوئے ڈیا کی تعریف کی۔ رابعہ نے تھوڑی دیر مزید ضد کی اور پھر گھر واپسی پر گلابی ڈیا اُس کے ہاتھ میں تھی۔

"پاپا، پاپا میرے سکول میں پکنک ہو رہی ہے۔"
"پاپا، مجھے گوگلز لا دیجئے گا اور کیپ بھی۔"

"پرانے گوگلز کا فیشن نہیں رہا ڈیڈ۔ آر کمپلیٹلی آؤٹ آف فیشن اور میری کیپ کا رنگ میرے ڈریس سے میچنگ نہیں۔ مجھے اپنے کپڑوں سے میچنگ کی کیپ چاہیے۔"

وقت یوں ہی پر لگا کر اُڑتا رہا اور رابعہ نے اپنے والدین کی ناک میں دم کر رکھا۔ ہر وقت ہر لمحہ وہ کوئی نہ کوئی نئی فرمائش لے کر بیٹھ جاتی اور ضد بھی پوری کروا کر ہی دم لیتی۔ رابعہ نے تعلیمی منازل طے کیں اور پھر اس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے دو سال کے بعد خدا نے اسے اولاد کی نعمت سے نوازا، جس کا نام انہوں نے رُخسار رکھا۔ رُخسار بہت پیاری اور خوب صورت بچی تھی۔ اور سب کی بے حد لاڈلی۔ اُس کی ہر فرمائش اُس کی زبان بلکہ دل میں اٹھتے ہی پوری کر دی جاتی تھی۔ یوں وہ بہت ضدی ہو گئی۔ رُخسار سکول جانے لگی تو حالات نے پلٹا کھایا۔ رابعہ کے شوہر کو کاروبار میں بہت نقصان ہو گیا۔ ایسے میں رابعہ نے ایک سکول میں ملازمت کر لی۔ ان کے لئے گھر کا خرچ چلانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا۔ رابعہ جتنا بچت کرنے کی کوشش کرتی، اتنا ہی رخسار کی فرمائشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ رابعہ رخسار کی فرمائشوں سے پریشان ہو جاتی تو نوبت پٹائی تک پہنچ جاتی۔ ایک دن رابعہ رُخسار کو لے کر سودا لینے کے لئے گھر سے نکلی۔ راستے میں ایک دکان پر سجی فراک دیکھ کر رخسار نے ضد پکڑ لی کہ مجھے یہ فراک چاہیے۔ رابعہ نے رخسار کو بہت سمجھایا، نہ ماننے پر اس نے رخسار کے گال پر ایک زور دار تھپڑ جڑ دیا۔ رُخسار رونے لگی۔

رابعہ نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹ کر لے گئی۔ سودا لینے جب رابعہ ہول سیل کی دکان پر پہنچی تو وہاں اس کے والدین بھی سودا لینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے رخسار کو روتے ہوئے دیکھا تو وجہ پوچھی، رابعہ نے وجہ بتائی۔

سودا لے کر جب یہ لوگ فارغ ہوئے تو رابعہ کو اس کے والدین اپنے گھر لے گئے۔ رابعہ کے پاپا نے رابعہ سے کہا۔ "بیٹا! مجھے افسوس ہے کہ تم نے رخسار پر ہاتھ اٹھایا۔"

"تمہیں یاد ہے بیٹا! کہ تم کتنی ضدی تھیں ہر وقت ہر چیز اور ہر بات میں ضد پکڑ کر بیٹھ جایا کرتی تھیں۔ مجھے یہ چاہیے وہ چاہیے۔ یہ فیشن، وہ آؤٹ آف فیشن ہے، کتنا تنگ کرتی تھیں تم۔"

"بیٹا! ہم نے تو تم پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا پھر کیوں تم نے رُخسار پر ہاتھ اٹھایا۔ اُسے پیار سے سمجھاؤ۔ وہ ابھی چھوٹی ہے، سمجھ جائے گی۔" رابعہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ "آئی ایم سوری پاپا! میں نے آپ لوگوں کا بہت دل دُکھایا ہے ناں۔ رخسار مجھے میری ضد کی سزا دے رہی ہے۔ آئندہ میں اس رُخسار کو سمجھاؤں گی، ان شاء اللہ وہ سمجھ جائے گی۔"

رابعہ نے رُخسار کا ہاتھ تھاما اور اللہ حافظ کہتی اپنے گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

(پہلا انعام: 200 روپے کی کتب)

ہم جاگ رہے ہیں

(کنول صابت، جہلم)

وہ تعداد میں دو تھے۔ آج ان کا ہدف حیدر آباد ایئر پورٹ میں دھماکا کرنا تھا۔ جب وہ پہلے گیٹ پر پہنچے تو خوشی کے مارے ان کی باچھیں کھل گئیں کہ گارڈ خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ اپنی پہلی رکاوٹ پار کرنے کے بعد وہ مین گیٹ پر پہنچے جو ان کی دوسری اور آخری رکاوٹ تھی مگر اس رکاوٹ کو پار کرنے کے لئے انہیں کچھ خاص تگ و دو نہ کرنی پڑی کیوں کہ انہوں نے دونوں گارڈز کی جیبوں میں ایک ایک کروڑ روپے جو رکھ دیے تھے۔

اندر داخل ہونے پر ان میں سے ایک سامان کے پاس کھڑا ہو گیا جو کہ گھاس پھونس پر مشتمل ایک بیگ تھا جب کہ دوسرا ائیر پورٹ کے باتھ روم میں گھس گیا جو کہ دھماکا کرنے کا مین پوائنٹ تھا۔ اپنے ساتھی کے باتھ روم میں گھستے ہی دوسرا دہشت گرد فوراً رفو چکر ہونے لگا مگر گارڈز نے اسے دبوچ لیا جنھیں اُن دونوں نے پیسے دیئے تھے۔ اس کی گرفتاری کے چند ہی لمحوں بعد ائیر پورٹ کے باتھ روم سے ایک دھماکے کی آواز آئی۔ موقع پر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ آواز دھماکے کی نہیں بلکہ گولی کی تھی جو کہ پہلے گیٹ پر سونے والے گارڈ نے خوش کش حملہ آور پر چلائی تھی اور بہت مہارت سے بم بلاسٹ ہونے سے بچا لیا تھا۔

جب اس گارڈ سے یہ پوچھا گیا کہ آپ کی ڈیوٹی تو گیٹ پر تھی، آپ یہاں کیسے پہنچے؟ تو اس نے جواب دیا کہ جب یہ دونوں دہشت گرد گاڑی سے اترے تو مجھے ان میں سے ایک کی خود کش بم بلاسٹ جیکٹ نظر آگئی۔ تب میں جان بوجھ کر سو گیا اور اس سے پہلے میں ان کی نشاندہی مین گیٹ کے گارڈز کو کر چکا تھا کہ یہ دونوں جو کچھ کریں ان کو کرنے دو۔ پھر جب یہ دونوں مین گیٹ پار کر گئے تو میں گارڈز کو ضروری ہدایات دینے کے بعد فوراً خود کش حملہ آور کا تعاقب کرنے لگا اور باقی کا حال آپ کے سامنے ہے۔

اس کے بعد جب اس گارڈز کا سامنا زندہ گرفتار ہونے والے دہشت گرد سے ہوا تو اس نے پوچھا کہ تم تو گیٹ پر سو رہے تھے، تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا۔ تب گارڈز نے جواب دیا:
میں سو نہیں جاگ رہا تھا بلکہ ہم سب جاگ رہے ہیں۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

اِصلاحی حادثہ

(ثاقب نواز، لاہور)

میں اور میرا دوست حارث معمول کے مطابق کالج سے واپس گھر کی طرف جا رہے تھے۔ ہم آج بہت خوش تھے کیوں کہ آج کالج کے سالانہ امتحانات اختتام پذیر ہوئے تھے۔ ہم دونوں آپس میں امتحانات کی باتیں کرتے ہوئے کالج روڈ سے نکل کر مین روڈ پر پہنچے۔ اچانک ایک گاڑی کے زور دار بریک چرچرانے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی بے شمار آوازیں گونجنے لگیں۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو روڈ پر مجمع لگ گیا تھا۔ پتا چلا کہ ایک نوجوان کا گاڑی کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور گاڑی کا ڈرائیور موقع پا کر فرار ہو گیا ہے۔ ہم مجمع چیرتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ نوجوان زندگی موت کی کش مکش میں مبتلا تھا اور خون میں لت پت بھی۔ مجھے اردگرد کے لوگوں پر شدید غصہ آیا کہ سب لوگ زخمی کی مدد کرنے کے بجائے حادثے پر تبصرے کر رہے تھے اور اسے پولیس کیس کہتے ہوئے ہاتھ تک نہیں لگا رہے تھے۔

حارث نے زخمی کو کندھے پر اٹھایا اور قریب ہی شالیمار ہاسپٹل میں لے گیا۔ اس کی جیب میں موجود کاغذات کی مدد سے اس کے گھر ہم نے اطلاع دے دی۔ قریباً تین چار گھنٹے میں زخمی نوجوان کو ہوش آیا اور ہم ڈاکٹر سے اجازت لے کر اسے ملنے گئے۔ وہ شخص ہمارے گلے لگ کر رونا شروع ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ میں اپنے بوڑھے ماں باپ کا کہنا نہیں مانتا تھا اور آوارہ گردی کرتا تھا۔ آج اگر میں مر جاتا تو سیدھا دوزخ میں جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک اور موقع دیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں اپنے ماں باپ کا سہارا بنوں گا اور جنت حاصل کروں گا۔ اُس نوجوان کی باتیں سُن کر ہماری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ ہم بہت خوش تھے کہ ہماری وجہ سے کسی انسان کی نہ صرف زندگی بچ گئی بلکہ اصلاح بھی ہو گئی۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

آج وہ دن آگیا تھا جس کے لیے غلام رحمان پچھلے تین ماہ سے تیاری کر رہا تھا۔ یہ تیاری کوئی معمولی نوعیت کی تیاری نہیں تھی۔

مٹی کھیتوں میں ہو تو اناج پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ جب اس مٹی پر انسانی ہاتھ اپنی کاری گری دکھاتے ہیں تو بھٹے سے حرارت لے کر ہی مٹی اینٹ بن جاتی ہے۔ اناج سے بھوک مٹتی ہے۔ اینٹ سے گھر بنائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں مٹی کے لیے عزت کا باعث ہیں۔ لیکن جب اسی مٹی سے بنے انسان پر شیطانی جذبے غالب آجاتے ہیں تو یہ اینٹ ہتھیار بن جاتی ہے۔

غلام رحمان بھی ایک ایسا ہی ہتھیار تھا۔ تین ماہ کی سخت ٹریننگ نے اس کے جسم اور دل ودماغ کو فولاد بنا دیا تھا۔ نفرت اس کی آنکھوں میں دہکتی رہتی تھی۔ غربت سے نفرت، بھوک سے نفرت، سرمایہ داروں سے نفرت، سیاست دانوں سے نفرت اور انصاف نہ ملنے پر حکومتی اداروں سے نفرت۔۔۔ اور یہ آگ الطاف نے اس کے اندر لگائی تھی۔ الطاف نے ہی اسے انتقام لینے کے لیے تیار کیا تھا۔ الطاف لومڑی کی طرح چالاک اور عیار آدمی تھا۔ اس نے جسم سے زیادہ غلام رحمان کے دماغ پر کام کیا تھا۔ اور اب غلام رحمان کا ذہن پوری طرح الطاف کے قابو میں تھا۔

دنیا میں بسنے والے انسان اپنی موت سے لاعلم ہیں، بہت کم لوگ ایسے ہیں، جنہیں وقت سے پہلے اپنی موت کی آمد کا علم ہو جائے۔ اور ان سے بھی کم لوگ وہ ہیں، جو موت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں۔ غلام رحمان بھی ان میں سے ایک تھا۔ آج غلام رحمان اپنی موت کے سفر پر نکلا تھا۔ آج سے ٹھیک تین ماہ پہلے جب وہ اپنے گھر سے نکلا تھا تو اس نے اپنی والدہ کو کپڑے کا ایک تھیلا پکڑایا تھا۔

"الوداع امی جان۔۔۔!" ماں نے تھیلا کھول کر دیکھا۔ اس میں پانچ پانچ ہزار کے بے شمار کرنسی نوٹ تھے۔ اس کی ماں پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

"بیٹا! تم کہاں جا رہے ہو اور یہ رقم کہاں سے آئی ہے۔۔۔؟" غلام کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "امی! میں کام پر جا رہا ہوں۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا ہوں لیکن میرے کندھوں پر ذمہ داری بڑی ہے۔ میں نہیں دیکھ سکتا اس گھر میں بھوک۔۔۔ میری بہنوں کے پھٹے کپڑے۔۔۔ ابو جی کی بیماری۔۔۔ آپ کا غربت کی وجہ سے پریشان رہنا میں نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے کام کرنا ہو گا۔ مجھے یہاں سے جانا ہو گا۔ یہ رقم میرے یہاں سے جانے کی قیمت ہے۔ یہ رقم آپ سب کے لیے خوش حالی لے کر آئے گی۔"

"غلام! تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ تم ہماری آنکھوں سے دور ہو جاؤ گے تو ہم خوش کیسے رہ پائیں گے ــــــ؟"

"خوش تو رہنا پڑے گا امی جان ـــــ! کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے ـــــ" غلام بولا۔

"جو میں کھونے جارہی ہوں، وہ سب سے زیادہ قیمتی ہے۔" امی رو پڑی۔

"اور میرے لیے سب سے زیادہ قیمتی آپ لوگوں کی خوشیاں ہیں۔"

"الوداع امی جان ـــــ! الوداع ـــــ" امی جانتی تھی کہ غلام نہیں رکے گا۔ امی نے پیچھے سے آواز لگائی۔ "غلام! ہماری خوشیوں کے لیے تم ہم سے جدا ہو رہے ہو۔ ہم تمہارے اپنے ہیں۔

لیکن بیٹا! تم اُن لوگوں کو بھی خوش رکھنا جو تمہارے اپنے نہیں، اللہ کی پیدا کی ہوئی مخلوق سے دعا لو گے تو راحت پاؤ گے۔ بیٹا! دوبارہ کب آؤ گے ـــــ" غلام نے پلٹ کر دیکھا۔

"امی جان! مرنے سے پہلے ایک بار تو ہم ضرور ملیں گے ـــــ" امی کا دل دھڑک کر رہ گیا۔

غلام دور نکل گیا تھا۔ امی کے لیے اسے روکنا ناممکن تھا لیکن امی سمجھ گئی تھی کہ غلام کسی معمولی سفر پر نہیں گیا۔ کام کے سلسلے میں اکثر لوگ دیس پردیس جاتے ہیں لیکن غلام جیسے گیا تھا، وہ امی کو خوف زدہ کر گیا تھا۔ امی سمجھ گئی تھی کہ غلام کی منزل اندھیروں میں ہے۔ وہ گم راہ ہو چکا ہے۔ "اللہ ـــــ میرے غلام کو اپنی حفاظت میں رکھنا ـــــ" ان حالات میں وہ بے چاری اور کیا دعا مانگ سکتی تھی۔

غلام تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تھا تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی لیکن غریب کے گھر آنے والی خوشی کسی مسافر یا مہمان جیسی ہوتی ہے، دونوں کو آخر میں جانا ہوتا ہے۔

گھر میں تنگ دستی تو پہلے ہی تھی۔ پھر غلام کے ابو ایک حادثے کا شکار ہو کر دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گئے۔ غلام چھوٹا تھا۔ امی اور اس کی دو بڑی بہنیں سلائی کڑھائی کا کام کرنے لگیں۔ غلام سکول نہیں جاسکا۔ اس نے ایک ریستوران میں اجرت پر کام شروع کر دیا تھا۔ یہاں سے پیسوں کے علاوہ اسے روٹیاں اور بچا کھچا سالن مل جاتا تھا۔ یوں کسی نہ کسی طور وہ رات کو پیٹ بھر کر سوتے تھے۔ پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔

ابو جی بیمار تھے۔ ان کی دوا کے لیے پیسے نہیں تھے۔ غلام یہ سوچ کر گھر سے نکلا کہ آج ریستوران کے مالک سے ملنے والی اجرت سے وہ ابو کے لیے دوا لے گا لیکن آج کا دن اس کے لیے اپنے ساتھ تکلیف لے کر آیا تھا۔ جانے کیا ہوا تھا، شہر میں آج ہڑتال تھی۔ تمام دکانیں بند تھیں۔ ریستوران میں بھی اکا دکا لوگ تھے۔ گاہکوں کی آمد نہ ہونے کی وجہ سے مالک نے اس کی چھٹی کرا دی۔ اجرت کے ساتھ ساتھ اسے کھانے پینے کا وسیلہ بھی ہاتھ سے نکلتا نظر آیا۔ اس کی منت سماجت بھی بے کار گئی تھی۔ اب وہ سڑکوں پر آوارہ پھر رہا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ خالی ہاتھ گھر واپس لوٹ جائے۔ اپنی آوارہ گردی کے دوران اس نے محسوس کیا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی اس کے تعاقب میں ہے۔ اس آدمی کا رنگ سفید اور قد دراز تھا۔ چہرے پر سیاہ رنگ کی عینک موجود تھی۔ اس کی جسمانی ساخت بھی مضبوط تھی۔

شام ہوئی پھر رات ہو گئی۔ غلام کو اس وقت گھر ہونا چاہیے تھا لیکن وہ گھر کیسے جاتا، اس کے پاس تو کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ چودھویں رات کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ روشنی بکھیر رہا تھا۔ ایسے میں غلام نے ایک کتے کو دیکھا۔ کتے کے منہ میں ایک لفافہ دبا ہوا تھا۔ وہ اسی طرف آرہا تھا۔ غلام تڑپ کر رہ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس لفافے میں کھانے کے لیے کچھ ہو۔ اس نے سوچا، بھوک نے اسے مجبور کر دیا۔ وہ اٹھا اور کتے کے تعاقب کے لیے لپکا۔ کتا خطرے کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے دوڑ لگا دی۔ غلام بھوک سے دیوانہ ہو چکا تھا۔

"رک جاؤ بیٹا! کیا تم پاگل ہو؟" اس آدمی نے غلام کو پکڑ لیا۔

"وہ ـــــ وہ کتا ـــــ کھانا ـــــ میرے گھر والے بھوکے ہیں ـــــ"

غلام رونے لگا۔ وہ آدمی پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ غلام نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر حیران رہ گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو صبح سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ غلام کی آنکھوں میں سوال دیکھ کر وہ بولا۔

"گھبراؤ مت ـــــ مجھے تم سے ہم دردی ہے۔ میں نے صبح تمہیں پریشانی کی حالت میں دیکھا تو سوچا کہ تمہاری مشکل حل کروں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ تم کھانے کی وجہ سے پریشان ہو۔ آؤ میرے ساتھ! میں تمہارے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں ـــــ"

غلام اس آدمی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس آدمی کو غلام کی تمام پریشانیوں سے آگاہی ہو چکی تھی۔ ایک ہوٹل سے اس آدمی نے بہت مہنگا کھانا خرید کر غلام کے حوالے کیا۔ کچھ نقدی بھی اسے دی۔ غلام تشکر سے اس آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رخصت سے پہلے غلام

نے پوچھا۔

"آپ کا نام کیا ہے۔۔۔؟"

"الطاف۔۔۔ میرا نام الطاف ہے۔۔۔" وہ دن گزرا۔ پھر الطاف اور غلام کے رابطے بڑھنے لگے۔ الطاف نے غلام کو اپنے کام کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ اور پھر وہ دن آیا جب الطاف نے غلام کو بیس لاکھ روپے نقد دیئے اور کہا۔

"یہ رقم اپنے گھر والوں کو دے آؤ۔ یہ رقم ان کا سہارا ہو گی اور آج سے تم ہمارے ہو۔۔۔" غلام کم عمر تھا لیکن نا سمجھ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس بڑی رقم کے عوض اس نے خود کو فروخت کر دیا ہے اور اس سودے کو وہ پوری ایمان داری کے ساتھ نبھانا چاہتا تھا۔

آخر الطاف نے اسے سہارا دیا تھا۔

پھر غلام کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ ایک بھیانک زندگی جو صرف اور صرف مفاد پرستوں کو ان کے مفاد تک پہنچانے کے لیے تھی۔

اور آج رات غلام اپنے مشن پر نکلا تھا، جو الطاف نے ایک گلی سے اس کے ذمہ لگایا تھا۔ وہ مشن جس کی کامیابی غلام کی موت تھی۔ غلام خودکشی کے سفر پر تھا۔ ایک موڑ پر اس نے دکان کے باہر دیکھا، ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں۔ تین دن پہلے بس سٹینڈ پر ایک خودکش حملہ ہوا تھا، یہ خبر اسی حوالے سے تھی۔ جن کے عزیز مر گئے تھے، وہ رو رہے تھے۔ زخمی ہسپتال میں پڑے تڑپ رہے تھے۔ وہ مسکرانے لگا۔ اسے ان لوگوں کے درد سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ تو زخم لگانے آیا تھا۔ الطاف اور اس جیسے لوگ حکومت سے اپنے مطالبے منوانے کے لیے بے گناہ لوگوں کو شکار بنا رہے تھے۔ اور غلام سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔

وہ تیزی سے اپنے نشانے کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اب وہ ملت ہسپتال کے سامنے کھڑا تھا۔ بیرونی گیٹ پر دو پہرے دار موجود تھے۔ ان دونوں کے پاس اسلحہ بارود چیک کرنے کے آلات تھے۔ وہ ملت ہسپتال میں موجود لوگوں پر حملہ کرنے آیا تھا۔

پہرے داروں کی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہونا اس کے لیے نا ممکن نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔ پھر وہ انتظار کرنے لگا کہ گیٹ پر لوگوں کا ہجوم ہو تو وہ حملہ کرے۔

اتنے میں ایمبولینس کے آنے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

ایمبولینس کو راستہ دینے کے لئے لوگ ایک جگہ جمع ہونے لگے تھے۔ غلام تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ گیٹ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس کے لباس کے نیچے بارود سے بھری جیکٹ موجود تھی۔ اور ہاتھ اس بٹن پر تھا، جس کے دبتے ہی قیامت آجانی تھی۔ لمحے صدیوں جتنے طویل ہو چکے تھے۔ ایک اور خودکش حملہ ہونے جا رہا تھا کہ اچانک غلام کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ "بھیا۔۔۔ آپ یہاں۔۔۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ امی ہسپتال میں ہے۔۔۔" غلام کو اپنے جسم میں موجود خون رگوں میں جمتا محسوس ہوا۔ اس نے دیکھا، اس کی بڑی بہن شگفتہ اس کے پاس کھڑی تھی۔ آج تین ماہ کے بعد اس نے اپنی بہن کو دیکھا تھا اور امی اسی ہسپتال میں تھی، شگفتہ اس کے کندھے سے لگی رو رہی تھی۔ تب پہرے داروں نے انہیں اندر جانے کا راستہ دے دیا تھا۔ امی کو وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ شگفتہ نے بتایا کہ امی کا بلڈ پریشر بہت تیز ہو گیا تھا، جان جانے کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ امی کو لے کر شہر کے ہسپتال لے آئی تھی۔

"بھیا۔۔۔ تمہارے غم میں امی کا یہ حال ہوا ہے۔ تمہیں دیکھ کر وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔" وارڈ میں امی اپنے بستر پر چت لیٹی تھی۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے چھت کو گھور رہی تھی۔

"امی! دیکھو، کون آیا ہے۔" شگفتہ خوشی سے بولی۔ غلام کو دیکھ کر امی کے بے جان جسم میں جیسے جان آگئی تھی۔ وہ دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، ایسا ملاپ کب کس نے دیکھا تھا۔

"میرے بچے! مجھے تو لگتا تھا کہ میں نے تمہیں کھو دیا۔۔۔ اب تم ہم سے کبھی نہیں ملو گے۔۔۔؟"

"میں تو یہ کر گیا تھا کہ مرنے سے پہلے آپ سے ایک بار ضرور ملوں گا۔۔۔"

"بیٹا! واپس لوٹ آؤ۔۔۔"

"اب یہ ممکن نہیں۔۔۔"

"تو پھر جو کام کرنے آئے ہو، وہ کرو۔۔۔" امی کو غصہ آگیا۔

غلام حیران رہ گیا۔ امی کو ہر بات کی خبر تھی۔ وہ نادان نہیں جانتا تھا، آخر ماں کو ماں کیوں کہتے ہیں۔

"آج رات یہاں جو حادثہ ہو گا، اس میں تمہاری ماں اور بہن کو بھی شامل ہونا چاہیے۔۔۔" امی شاید کچھ اور بھی کہتی کہ اچانک غلام کے پاس

موجود موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ غلام نے دیکھا، دوسری طرف الطاف تھا۔ غلام الطاف کی بات سننے لگا۔

"شاباش۔۔۔ شاباش۔۔۔ تم نے پہرے داروں کی موجودگی میں بھی اندر جا کر کمال کر دیا۔ اب جلدی سے اپنا کام کرو۔۔۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا۔۔۔" غلام حیرت زدہ رہ گیا۔

میں نے خبر رکھنے کے لیے ایک لڑکا تمہارے پیچھے لگایا ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔

"یہاں میری ماں اور بہن موجود ہے، کیا کروں۔۔۔؟" غلام کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"اپنے مقصد پر نظر رکھو، جنت تمہاری منتظر ہے۔" غلام نے فون بند کر دیا۔

"میرے بچے خودکشی اور شہادت میں صرف نظریے کا فرق ہوتا ہے۔ اب یہ تمہیں طے کرنا ہے۔"

غلام کی ماں تعریف کے قابل تھی۔ ایسا حوصلہ بہت کم ماؤں میں ہوتا ہے۔

"میں آپ کو شرمندہ نہیں کروں گا۔۔۔" غلام ایک نئے ولولے کے ساتھ واپس روانہ ہوا۔ امی نم آنکھوں سے اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ شگفتہ رونے لگی تھی، وہ جان گئی تھی کہ اب وہ اپنے بھائی کو کبھی نہیں دیکھ پائے گی۔

رات کے پانچ بج رہے تھے۔ نئی صبح طلوع ہونے کو تھی۔ جب غلام الطاف کے اڈے پر پہنچا۔ الطاف اور اس کے بیس سے زیادہ گم راہ دوستوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ الطاف بہت غصے میں نظر آ رہا تھا۔

"کام کیوں نہیں ہوا۔۔۔" الطاف سانپ کی طرح پھنکارا۔

"اتنا سنہری موقع تم نے گنوا دیا۔۔۔"

"جناب! میں کیا کرتا جیکٹ کا یہ بٹن کام نہیں کر رہا۔۔۔" غلام ہنس پڑا۔ الطاف کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

"دکھاؤ مجھے۔۔۔" اس نے چیک کرنے کے لیے غلام کے جسم پر موجود جیکٹ کا بٹن اندھا دھند دبایا۔ دوسرے ہی لمحے ایک زور دار دھماکا ہوا۔ انسانی اعضاء دور دور تک بکھر گئے۔

غلام کی امی درست کہتی تھی، خودکشی اور شہادت میں فرق صرف نظریے کا ہوتا ہے۔ ہسپتال میں غلام کی موت خودکشی تھی، یہاں شہادت تھی۔

سلام ان شہیدوں پر جن کی کہانیاں سینوں میں دفن ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی غلام رحمان کی امی کے سینے میں دفن ہے۔

کالا منہ کوے کا

تاثیر حیات (راولپنڈی)

بی گلہری کی دکان نے جنگل میں نہ صرف جدت بلکہ سہولت کی بھی بنیاد ڈال دی۔ اس سے پہلے جنگل کے مکینوں کو اشیائے ضروریہ خریدنے کے لئے بہت دور جانا پڑتا تھا۔ اس لئے سب ہی بہت خوش تھے۔ خرگوش کو گاجریں لینی ہوں یا بندر کو نمک لینا ہو، چڑیا کو کھچڑی کے لئے چاول چاہیے ہوں، چوہے کو پنیر لینا ہو یا پھر گینڈے کو اپھارے کی صورت میں چورن یا اجوائن درکار ہو، سب بی گلہری کی "دستیاب گاہ" سے رجوع کرتے۔ بی گلہری کی دیانت داری اور اخلاق کی وجہ سے ان کا کاروبار خوب چل نکلا۔

بی گلہری قریبی قصبے سے بندر میاں کے ہول سیل سٹور سے ریڑھے پر سامان لاتیں، جسے بھالو میاں اجرت پر کھینچتے۔ یوں بی گلہری کو سودا لانے میں بھی مشکل نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ ہر اتوار کو دکان بند کر کے سودا لے آتیں۔ دکان بی گلہری کی پرانی کھوہ میں تھی، جس میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے دکان کی شکل دی گئی تھی۔ بی گلہری کی دکان کے سامنے ہی ایک درخت پر ایک کوا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن کوا نمک لینے بی گلہری کی دکان پر آیا مگر اس کے پاس پیسے نہ تھے اور وہ ادھار ہی نمک لے کر چلا گیا مگر اگلے ہی دن وہ ادھار پنیر لینے کو پھر آ دھمکا۔ بی گلہری نے پیسے مانگے تو پھر اپنی مجبوری کا رونا رونے لگا اور پنیر لے کر چلا گیا۔ اب کوے کا یہی معمول بن گیا۔ بالآخر بی گلہری نے کوے کو ادھار دینے سے انکار کر دیا اور کوا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ کچھ دن تو سکون سے گزرے اور کوا ادھار لینے نہیں آیا بلکہ وہ اس ڈر سے بی گلہری کے سامنے ہی نہ آتا کہ کہیں بی گلہری اسے ادھار چکانے کا نہ کہہ دے۔ درحقیقت وہ اپنے گھونسلے میں بیٹھ کر بی گلہری کی دکان پر رش دیکھ کر کڑھتا بھی رہتا۔ اسے بی گلہری کے خوب چلتے کاروبار سے جلن ہوتی۔ بی گلہری کے ایک دو بار پیسے کے تقاضے پر بھی کوے نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ دراصل کوا کسی چور راستے کی تلاش میں تھا۔

ایک اتوار حسب معمول دکان بند کر کے بی گلہری نے سودا لا کر دکان میں ڈال دیا مگر جب اگلی صبح دکان کھولی تو چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ بی گلہری نے چیزوں کو سمیٹا تو اس نے بہت سی چیزیں غائب پائیں۔ گلہری کافی پریشان ہوئی مگر پھر گاہکوں کی آمد پر اس کا دھیان بٹ گیا۔ شام تک بی گلہری اس واقعے کو بھول چکی تھی مگر اگلی صبح پھر دکان سے کھانے کی چیزیں غائب تھیں اور پھر یہ بات معمول بنتی گئی۔ گلہری اس صورت حال سے کافی پریشان

ہوئی۔ اس نے اپنی دکان کی حتی الامکان نگرانی بھی کی مگر بے سود کیوں کہ چور بہت چالاک تھا اور وہ کسی وقت بھی آنکھ بچا کے چیزیں لے اڑتا تھا۔

ان ہی دنوں بی گلہری کا دوست بنٹو گاؤں سے جنگل، بی گلہری سے ملنے آیا۔ بنٹو ایک چالاک اور سمجھ دار چوہا تھا۔ اس نے بی گلہری کو پریشان دیکھا تو اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔ گلہری نے اپنا مسئلہ بنٹو کو بتایا تو اس نے گلہری کو تسلی دی اور چور کے پکڑنے میں اس کی مدد کرنے کی یقین دہانی کروائی۔ بنٹو نے جب چور کو رنگے ہاتھوں پکڑنے بلکہ اس کے ہاتھ پاؤں رنگنے کا منصوبہ بی گلہری کے گوش گزار کیا تو وہ منصوبہ بی گلہری کو بے حد پسند آیا۔

بنٹو نے سب سے پہلے دکان کے کھلے روشن دان میں ایک شیشہ لگا کر اسے بند کر دیا کیوں کہ بنٹو کے خیال میں چور کا یہی چور راستہ تھا۔ پھر اپنے پروگرام کے مطابق شام کو دکان کے ایک پٹ والے دروازے کی چٹخنی کھول کر دروازے کے اوپر بنے روشن دان کی اندرونی طرف ایک بالٹی لے کر بیٹھ گیا، جس میں پانی میں گھلا چونا تھا۔ شام ڈھلنے کے بعد بنٹو کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا کہ روشن دان کے شیشے سے کوئی چیز ٹکرائی، شاید چور اپنے پرانے راستے سے اندر آنا چاہتا تھا۔ بنٹو ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا اور چونے کی بالٹی ہاتھ میں پکڑلی۔ حسبِ توقع کچھ دیر بعد دھیرے سے دروازہ کھلا اور اندھیرے میں ایک ہیولا سا اندر آیا اور دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا ہو کر اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ شاید اسے اندھیرے میں صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ بنٹو کو اسی موقع کا انتظار تھا، اس نے اس ہیولے پر چونے کی بالٹی الٹ دی۔ آنے والا اس حملے کے لئے قطعاً تیار نہ تھا، وہ سخت بوکھلا گیا اور منہ سے بے ربط آوازیں نکالتا ہوا باہر بھاگ نکلا۔

اگلی صبح بی گلہری کی آنکھ شور سن کر کھلی تو اس نے بوکھلا کر بنٹو کو جگا دیا۔ بنٹو آنکھیں ملتے ملتے بی گلہری کے ساتھ باہر آیا تو دیکھا کہ کوّے کے گھر میں جھگڑا ہو رہا تھا اور جنگل کے باقی جانور بھی شور سن کر اس کے گھونسلے کے گرد جمع تھے۔

پاس جا کے معلوم ہوا کہ کوا پورے کا پورا سفیدی میں رنگا ہوا تھا، اسے اپنے گھر میں دیکھ کے کوئی پہچان نہ سکی اور دھکے دے کر باہر نکالنے لگی۔ کوّے نے لاکھ صفائیاں پیش کیں مگر بے سود۔ بنٹو اور بی گلہری یہ دیکھ کر سارا معاملہ سمجھ گئے۔ بنٹو کی تو ہنسی ہی نہ رکتی تھی۔ اس کی ہنسی ہی کی وجہ سے سارے جانور بنٹو کی طرف متوجہ ہو گئے مگر بنٹو کی ساری توجہ کوئی کی طرف تھی۔ پھر وہ گلا صاف کر کے کوئی سے مخاطب ہوا۔

"بہن! کوا صحیح کہتا ہے۔ یہ ہے تو تمہارا گھر والا ہی مگر کسی حادثے کا شکار ہو کر اپنے کالے بدن کو سفید کر بیٹھا ہے۔"

"چل ہٹ آگیا بڑی صفائیاں دینے والا"۔ کوئی غصے سے بولی۔

"تجھے کیا پتا یہ میرا گھر والا ہے، خدا جانے وہ بے چارہ کہاں ہے اور یہ کہاں سے منہ اٹھا کے آگیا۔" کوئی نے غصے سے کوّے کو دو دو ٹھونگیں رسید کیے تو کوا لڑکھڑا کے گر پڑا۔

"مجھے نہیں پتا ہو گا تو کسے پتا ہو گا۔" بنٹو اپنا اگلا دایاں پنجا بائیں پنجے پر مار کے ہنستے ہوئے بولا اور پھر سب کو رات کی ساری کہانی سنا ڈالی۔ کوّے کا تو شرم کے مارے برا حال تھا جب کہ باقی جانور ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

"ارے واہ چور کی ڈاڑھی میں تنکا تو سنا تھا مگر یہاں تو چور کی ڈاڑھی میں سفیدی والا محاورہ صحیح رہے گا۔" پیچھے کھڑے زیبرے نے ہنستے ہوئے ہانک لگائی۔

"بھئی چور کی ڈاڑھی چھوڑ، یہاں تو وہ کالی دم تک سفیدی میں ڈوب گیا ہے۔" لگڑ بگڑ نے ٹکڑا لگایا۔

"ارے بنٹو! تم نے تو یہاں معاملہ ہی الٹ کر دیا۔ چور کا منہ کالا کرتے ہیں، چور کے کالے منہ کو تم نے سفید ہی کر دیا۔ بے چارہ چوری سے ہی کیا گیا، اسے تو گھر نکالا بھی ملنے والا تھا۔" لومڑی ہنستے ہوئے بنٹو سے بولی۔ جب کہ کوا شرمساری سے بی گلہری سے معافی مانگ رہا تھا۔ بی گلہری نے جھٹ کوّے کو معاف کر دیا کیوں کہ کوّے کی جتنی سبکی ہو چکی تھی، وہ اس کے لئے ایک سزا ہی کے مانند تھی۔ کوّے نے دل ہی دل میں آئندہ چوری نہ کرنے کا مصمم ارادہ کیا اور بی گلہری کا نقصان پورا کرنے کا کہا۔ ابھی تو اسے اپنی کوئی کو بھی منانا تھا۔ جو ناراض ہو کر گھونسلے کے اندر جا بیٹھی تھی۔ جب کہ باقی جانور کوّے کی حالت پہ ہنستے ہوئے اپنی اپنی راہ کو ہو لیے۔

وہ آئی ہنسی!

☆ایک بچے سے اس کے ابو نے کہا کہ بیٹا سکول میں جا کر میٹھی میٹھی باتیں کرنا۔ سکول میں جب میڈم نے بچے سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے تو اس نے جواب دیا، میرا نام لڈو ہے۔ جب میڈم نے والد کا نام پوچھا تو بچہ بولا، میرے ابو کا نام ڈھوڈا ہے اور جب ماں کا نام پوچھا تو بچہ بولا، میری امی کا نام چم چم ہے اور جب بہن کے بارے میں پوچھا گیا تو بولا، بہن کا نام برفی ہے۔

مس نے پوچھا: تم رہتے کہاں ہو؟

ہم مٹھائی کے ڈبے میں رہتے ہیں۔ (ذیشان اصغر، جوہر آباد)

☆چار گپ باز بیٹھے تھے۔ پہلا گپ باز: ہمارے ملک میں سردی کی اتنی شدت ہے کہ لوگ دو دو کمبل لے کر سوتے ہیں۔ دوسرا گپ باز: ہمارے ملک میں تو سردی کی وجہ سے چار چار کمبل لے کر سوتے ہیں۔ تیسرا گپ باز: یہ تو کچھ نہیں، ہمارے ملک میں لوگ چھ چھ کمبل لے کر سوتے ہیں۔ چوتھا گپ باز: یار یہ بھی کوئی سردی ہے! ہمارے ملک میں تو سردی سے گائیں دودھ کی بجائے قلفیاں دیتی ہیں۔

(زرمین خان، بھکر)

☆فٹ بال کے تین کھلاڑی آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ایک نے کہا، میں نے ایک دفعہ فٹ بال کو اتنے زور سے کک لگائی تھی کہ وہ ایک گھنٹے تک ہوا میں اڑتی رہی تھی پھر نیچے گر پڑی۔ دوسرے نے کہا کہ میں نے فٹ بال کو اتنے زور سے کک لگائی تھی کہ وہ ایک دن بعد واپس آئی تھی۔ تیسرے نے کہا کہ میں نے فٹ بال کو اتنے زور سے کک لگائی تھی کہ وہ پورے ایک مہینے بعد میرے گھر میں گری تھی اور اس کے ساتھ ایک کاغذ بندھا ہوا تھا جس پر لکھا تھا کہ آئندہ یہ گیند چاند پر نہ آئے۔ (محمد بلال احمد، احمد پور)

باپ بیٹے سے کہہ رہا تھا۔ بیٹا غم نہ کرو، یہ تو تقدیر کی بات ہے، تمہاری تقدیر میں فیل ہونا لکھا تھا، تم فیل ہو گئے۔

بیٹا خوش ہو کر بولا: تب تو بہت اچھا ہوا ڈیڈی! میں نے پڑھائی میں محنت نہیں کی ورنہ ساری محنت بے کار جاتی۔

(محمد احسن، سرگودھا)

☆تین پاگل اپنی مستیوں میں گم کہیں رواں دواں تھے کہ ایک کو خیال آیا کہ واپس گھر لوٹ چلیں۔ پہلا: ہمارے پاس پیسے بھی نہیں کہ بس پر چلے چلتے۔ دوسرا: نہیں یار! کیوں نہ ڈاک کے ذریعہ جایا جائے۔ تینوں پاگل لیٹر بکس میں اپنے سر پھنسا لیتے ہیں۔ اتنے میں پولیس آ جاتی ہے۔ پولیس کا خیال تھا کہ وہ خط چوری کر رہے ہیں تو انہوں نے پاگلوں کو جوتوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ پہلا: یار یہ کیا ہو رہا ہے؟ دوسرا: ڈاک کے ٹکٹ لگ رہے ہیں۔ (عدنان معروف، قصور)

☆استاد: میری ایک کتاب گم ہوئی ہے، جسے پتا ہو وہ بتا دے، میں کتاب اس کو دے دوں گا۔ اس کے علاوہ پچاس روپے نقد انعام بھی دوں گا۔

ایک شاگرد: جناب! پچاس روپے دے دیں، کتاب پہلے ہی میرے گھر میں ہے۔ (زہرا عثمان، لاہور)

☆ایک پاگل دوسرے پاگل سے: یار! ایک بات تو بتاؤ کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔ دوسرا پاگل: (جھنجلاتے ہوئے) میں نے تم سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ مجھ سے معاشرتی علوم کے سوال مت پوچھا کرو۔ پہلا: بدھو! میں نے تو تاریخ کا سوال پوچھا ہے۔

(طیبہ نصرت، سانگلا ہل)

☆ایک دیہاتی سینما گھر میں فلم دیکھنے آیا۔ دیہاتی پان کھا رہا تھا۔ فلم کے دوران اسے تھوکنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا "بھائی تھوکوں کہاں؟"

اس نے جواب دیا اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کی جیب میں تھوک دو۔ دیہاتی نے کہا اگر اسے پتا چل گیا تو؟ اس شخص نے جواب دیا "بھائی! تمہیں پتا چلا تھا کیا؟"

(ایمنہ چوہدری، آزاد کشمیر)

☆1965ء کی جنگ میں میاں بیوی ہوائی حملے سے جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ اچانک آدھے راستے میں بیوی کو کچھ یاد آیا کہ اس نے اپنے شوہر سے کہا "میرے مصنوعی دانت گھر رہ گئے ہیں، میں اپنے دانت لے آؤں۔" تو شوہر نے کہا، ہاں ہاں جاؤ لے آؤ، اوپر سے جہاز ڈبل روٹیاں پھینک رہا ہے، وہ کھانا۔"

(عبدالرحمان، لاہور)

شکاریات

باز آؤ، زندہ رہو

جنگل سے جنگل تک

حامد مشہود

ایک تو ماحول خوف ناک تھا اور اوپر سے اس علاقے کا مقامی راہ نما ہمیں باتیں بڑی خوف ناک سنا رہا تھا۔۔۔۔ ہم اس وقت ویران علاقے میں واقع ڈاک بنگلے کے باغیچے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ دور دور تک گھپ اندھیرا تھا، آسمان پر چاند دبیز بادلوں کے پیچھے کہیں چھپا سویا پڑا تھا۔ تیز ہوا سے بنگلے کے درختوں کے پتے سرسرا رہے تھے۔۔۔ اور گیدڑ کوک رہے تھے۔ کبھی کبھی جنگل سے کوئی جانور بھی چیخ اٹھتا تھا۔

"بابو جی! اس شیر سے تو خدا کی پناہ۔۔۔ یہ آدم خور درندہ شکر ہے کہ جنگل میں رہتا ہے۔ اگر کہیں یہ بدبخت گاؤں میں رہے تو صبح دوپہر شام، تینوں وقت حکیم چمن صاحب کی دوا سمجھ کر انسان ہی ہڑپ کرتا چلا جائے۔ یہ شیر تو تباہی کا دوسرا نام ہے، اپنا شکار کھاتا نہیں بلکہ چبائے بغیر ہڑپ کر جاتا ہے۔۔۔ اتنا بڑا بھاڑ سا منہ ہے اس کا۔"

یہ 1939ء کی بات ہے۔ موجودہ بھارتی پنجاب کے ایک جنگلی علاقے میں ایک شیر آدم خور ہو گیا تھا اور اس نے تین ماہ میں چھ افراد ختم کر ڈالے تھے۔ میرے ساتھ میرے معاون شکاری محمد انور، رمیش رائے اور بھگت سنگھ بھی موجود تھے۔ ہمیں محکمہ جنگلات کے ایک افسر نے آدم خور شیر کا خاتمہ کرنے کے لئے وہاں بلایا تھا۔ اس افسر کا نام "ویول" تھا۔ وہ انگلستان کا انگریز تھا اور گزشتہ بیس سال سے انڈیا میں مقیم تھا۔ ویول خود بھی شکاری تھا اور ہمارے ساتھ مل کر آدم خور شیر ختم کرنا چاہتا تھا۔ مقامی راہ نما "ٹمل" جب سانس لینے کے لئے رکتا تو میں سگار پینے میں مشغول ویول کو "ٹمل" کی ٹھیٹھ پنجابی کا انگریزی ترجمہ سنا دیتا تھا۔

"بابو جی! آج سے بارہ سال پہلے بھی یہاں ایک شیر آدم خور ہو گیا تھا۔ اس نے تو دو انگریز شکاری بھی کھا لئے تھے۔ ایک انگریز شکاری جنگل میں دوپہر کو کافی پیتے ہوئے اس کے ہتھے چڑھ گیا تھا تو دوسرا اس نے جھاڑیوں میں ہی ناپ لیا تھا۔ انگریزوں کا خون زیادہ مزے کا ہو گا، اسی لئے وہ انگریز کھانے لگا تھا۔"

میں نے ویول تک یہ داستان پہنچائی تو وہ مسکرایا "ٹمل از اے نائس پرسن۔" (ٹمل ایک عمدہ شخص ہے) پھر ٹمل بولا "بابو جی! اس انگریز شکاری کو یہ موجودہ آدم خور شیر بھی نہیں چھوڑے گا۔۔۔ اس سے کہیں کہ بھاگ جائے۔ تب میں نے ویول کو یہ بتایا کہ ٹمل اس کی تعریف کر رہا ہے تو اس نے ٹمل کا شکریہ ادا کیا۔

اور ٹمل میرے کان کے پاس جھک کر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا "بابو جی! آج سے تیس سال پہلے جنگل میں ایک جادوگر جربین رہتا تھا۔ بڑا ظالم جادوگر تھا وہ۔۔۔ انسان بھی ذبح کر دیتا تھا، ایک بار اس نے انسانی لہو حاصل کرنے کے لئے ایک دس سالہ بچی ذبح کر دی تو بچی کے والد آفتاب نے جربین کو مار ڈالا۔ اب میں کیا کہوں، سارا علاقہ کہتا ہے کہ

جریین شیر بن کر واپس دنیا میں آیا ہے کیوں کہ اس نے سب سے پہلے بوڑھا آفتاب کھا لیا ہے۔۔۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔ جادوگر نے آتے ہی اپنی دھشتی بھائی ہے۔"

یہ علم کی روشنی سے دور، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں غرق علاقہ تھا۔ ایسے علاقے میں توہمات کا گردش کرنا عام بات تھی۔ جریین نے اگر شیر بن کر آفتاب کھانا ہوتا تو تیس سال کا انتظار نہ کرتا۔ میں نے مطمئن ہو کر اپنے ساتھی بھگت سنگھ کو دیکھا جو کرسی پر ہی سر ڈالے سو رہا تھا۔ اگر وہ یہ بات سن لیتا تو بہت شور مچاتا۔ میں نے تمل کو صبح شکار کے لیے کچھ ہدایات دیں اور سونے کے لیے محفل برخاست کر دی۔

اس سے دوسرے دن ہم شکار کے لیے نکلے تو ویول کی ایک بہت بری عادت سامنے آئی۔ وہ دوران شکار گھنے جنگل میں سگار پیتا رہا۔ تمباکو تو ہے ہی انسان کے لیے زہر، پھر گھنے جنگل میں شکار کے دوران یہ کام بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی درندہ تمباکو جلنے کی بو سے انسان پر حملہ کر سکتا ہے یا اس کی بو یاد رکھ سکتا ہے۔ سرزنش پر ویول نے مجھے یقین دلایا کہ سگار پینے سے ہمیں کوئی حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ وہ کئی آدم خور درندے یوں ہی سگار پیتے پیتے ہی مار چکا ہے۔

آدم خور کا کھوج پہلے دن ناکام رہا۔ دوسرے دن برسات کا موسم خراب ہو گیا، ہم شکار کے لیے نہ نکل سکے اور سارا دن اپنے کتوں کو ڈاک بنگلے میں شکار کی دوبارہ مشق کراتے رہے، تربیت دہراتے رہے۔ شام کے وقت ہم نے کتوں کو دودھ پلایا اور ابلا ہوا نمکین گوشت کھلا کر خود باغیچے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے کہ اب بوندا باندی بند ہو گئی تھی۔

تب تمل نے مجھے ایک بہت اہم نکتہ بتایا۔ "بابو جی! اس شیر میں سونگھنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ ایک سنیاسی "رماز" جو اکثر جنگل میں جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے جاتا ہے، کہتا ہے کہ یہ شیر اپنی شیرنی کے ساتھ ایک غار میں نیل [illegible] میں رہتا ہے۔۔۔ جہاں اور بھی درندے رہتے تھے۔۔۔ اب آپ بتائیں یہ ہوا نہ جادو؟"

میرے سوالات کے جوابات میں یہ تفصیل سامنے آئی کہ جنگل میں ایک ایسی پہاڑی موجود تھی جس کے اندر طویل سرنگوں کی بھول بھلیاں موجود تھیں اور غار بنی تھی۔ وہاں درندے رہتے تھے، کچھ مستقل بنیادوں پر اور کچھ عارضی پناہ گاہ کے طور پر سیلاب، طوفان، بارش یا سردی سے بچنے کے لیے اندر گھس جاتے تھے۔ رماز کہتا تھا کہ اس شیر کا مستقل ٹھکانا تاریک سرنگیں تھیں۔۔۔ میں بات سمجھ گیا۔ شیر میں قوت شامہ کم ہوتی ہے، بہ نسبت اس کی قوت بصارت کے۔ وہ بہت دور سے جانور یا انسان دیکھ لیتا ہے۔ اندھیرے میں رہ رہ کر اس کی قوت شامہ تیز ہو گئی

بل ٹیریر نسل کا کتا

تھی۔ میرے پاس جرمن شیپرڈ اور ڈوبرمین جیسی قیمتی نسلوں کے کتے تھے۔ ہم انہیں بو کا پیچھا کرنے کی تربیت یوں دیتے تھے کہ ان کی آنکھیں باندھ کر انہیں مختلف اشیاء سونگھاتے تھے یا انہیں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایسی تربیت دیتے تھے۔ بعض اوقات پولیس اور ملٹری کے کتے بھی اندھیرے میں رکھ کر سراغ رسانی کے لیے تیار کئے جاتے ہیں۔ اب ننھے ذہین قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ اندھیرے میں جانور آنکھوں سے زیادہ اپنی ناک پر انحصار کرتے ہیں اور ان کی قوتِ شامہ تیز ہو جاتی ہے۔

بارش ختم ہوتے ہی تیز ہوا چلنے لگی اور گیلی مٹی سوکھ کر سخت ہو گئی، ہم اگلے دن ویول سمیت شکار کو نکلے۔ میں نے مقامی راہ نما کی مدد سے اس پہاڑی کا جائزہ لیا جس میں طویل سرنگیں موجود تھیں۔ ان سرنگوں کے کل چھ منہ تھے۔ میں نے شیر کی تلاش کے لئے دو دن کا ہدف مقرر کر لیا۔ اگر دو دن میں بھی شیر کا کوئی اتا پتا نہ ملتا تو میں ان سرنگوں میں گھسنے پر مجبور تھا۔۔۔ اگرچہ یہ ایک جان لیوا اور نہایت مشکل کام تھا۔

دو دن گزرے، شیر قابو نہ آیا۔ تیسرے دن علی الصبح اطلاع ملی کہ وہ ایک مقامی کسان کو اٹھا کر جنگل میں جا گھسا ہے۔ میں نے اس کے پنجوں کا کھرا نکالا۔۔۔ وہ اس پہاڑی کی ایک سرنگ میں موجود تھا۔ کتے بھی اس کی بو پا کر مخصوص انداز میں غرانے لگے تھے۔۔۔ ہم نے اپنی جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ مقامی لوگوں کو بلا کر پہاڑی کی چار سرنگوں کے منہ بند کر دیئے گئے۔ صرف ایک سرنگ کے پہاڑی میں دو آر پار منہ کھلے رکھے گئے۔ اور پھر میں سرنگ میں داخل ہوا۔

میرے ساتھ چار کتے تھے نیز بھگت سنگھ، ویول، دو مقامی بندوق بردار مرد اور پانچ نیزہ بردار جوان۔ ہم اس نیم تاریک سرنگ میں پھونک پھونک کر قدم آگے رکھتے تھے۔ سرنگ کوئی پندرہ فٹ اونچی اور تیس فٹ چوڑی تھی۔ کہیں کہیں سے یہ لمبائی اونچائی کم بھی پڑ جاتی تھی۔ ہم سرچ لائٹوں سے سرنگ کا کونا کونا روشن کرکے قدم آگے بڑھاتے تھے۔

چھوٹے موٹے درندے اور جانور وہاں سے نکل بھاگے تھے۔ دوسری طرف رمیش اور انور مقامی افراد کے ساتھ موجود تھے جو سب کلہاڑیوں اور ڈنڈوں سے مسلح تھے۔ رمیش میرا اس شکار میں نیا ساتھی تھا۔ اس کے پاس چار بل ٹیریر نسل کے کتے تھے۔

منصوبے کے تحت پہاڑ کے باہر موجود شکاری بھی صرف آدم خور کے ہی منتظر تھے۔ لہٰذا دوسرے درندوں کو بھاگنے کا موقع دیا جا رہا تھا۔

اور ویول تھا کہ مسلسل سگار پیے جا رہا تھا۔

آخر کار آدم خور درندہ بھی ہمیں ایک غار میں نظر آ گیا۔ وہ بھاگا تو ہم بھی کتے لے کر اس کے پیچھے سرپٹ بھاگے۔ ویول تمباکو پی پی کر اپنے پھیپھڑے سیاہ کر چکا تھا، لہٰذا اس کا دم پھول گیا اور وہ ہم سے بہت پیچھے رہ گیا۔ آخر وہ میرا ساتھی تھا، میں نے دوبار اس کی طرف پیچھے مڑ کر بھی دیکھا کہ انگریز شکاری کسی آفت کا ہی شکار نہ ہو جائے۔

وہ یوں بھاگ رہا تھا کہ گویا وزن سر پر اٹھا رکھا ہو۔ یہ سب تمباکو کا کمال تھا۔ ہم پہاڑ سے باہر نکلے تو کتوں کے دونوں گروہ آدم خور شیر قابو نہ کر پائے تھے۔ رمیش کے بل ٹیریرز نے کام چوپٹ کر ڈالا تھا۔ بل ٹیریر نسل کے کتے طاقت ور اور حملہ آور طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اور سفاک بھی۔۔۔ مگر ان میں عقل کم ہوتی ہے۔ رمیش کے کتے اندھا دھند بھاگتے شیر پر حملہ ہوئے تو ہمارا ایک کتا ان سے ٹکرا گیا۔ وہ سمجھے کہ کتے نے ان پر حملہ کیا ہے، سب ہمارے کتوں سے الجھ پڑے اور شیر کتوں بلکہ گولی سے بھی بچ نکلا۔

اب شیر کو دور اور تیز بھاگنے کا موقع مل گیا تھا۔ شیر اپنی جان بچانے کے لئے سرپٹ بھاگ رہا تھا، ہم اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ یوں ہی بہت فاصلہ طے ہو گیا اور شیر سبز جھاڑیوں میں جا گھسا۔ بہ ہر حال ہم نے اپنے کتوں کی مدد سے اسے ان جھاڑیوں میں سے بھی ڈھونڈ نکالا اور اسے اس کے انجام تک پہنچایا۔ رمیش کے بل ٹیریرز اب بھی میرے کتوں پر پلنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ میں نے بل ٹیریر کی حماقت کی وجہ سے ہی یہ کبھی نہیں پالا۔

اور ویول اب غائب تھا۔

پہاڑ کی سرنگ سے باہر نکل کر میں ذرا مطمئن ہو گیا تھا کہ اب اس پر آفت نہیں ٹوٹے گی اور اگر ٹوٹی بھی تو گن اس کے ہاتھ میں ہے۔ اچانک میرے عقب میں سرسراہٹ ہوئی۔۔۔ پھر ایک پھنکار ابھری۔ میں نے چونک کر دیکھا۔۔۔ ایک سیاہ ناگ جھاڑی میں سے بجلی کی طرح برآمد ہوا اور میرے گھوڑے کی طرف لپکا۔ میں نے گھوڑے کا پینترا بدلا۔۔۔ اور جوں ہی وہ قریب آیا، اس پر میں نے اپنا شکاری تھیلا پھینک دیا، وہ تھیلے سے الجھا تو میں نے اس پر کود کر رائفل کے کندے سے اس

کا کام تمام کر ڈالا۔

ایک مقامی گھڑ سوار جوان بولا "بابو شکاری! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اگر سانپ یا ناگ بدھ کے دن مار ڈالا جائے تو کسی نہ کسی پر مصیبت ضرور آتی ہے۔"

میں نے اس سے کہا "جگرا فضول باتوں پر کان نہیں دھرتے۔۔۔ یہ بھی تو اس علاقے میں مشہور ہے کہ جزبین جادوگر آدم خور شیر بن کر عرصہ تیس سال بعد آیا ہے۔ سامنے آدم خور شیر کی لاش پڑی ہے۔۔۔ اگر یہ جادوگر ہے تو موت کی کھائی میں کیوں گرا، دھواں بن کر ہوا میں تحلیل کیوں نہ ہو گیا۔"

اسی وقت جھاڑیوں میں ایک اور ناگ پھنکارا۔ میں نے دیکھا، ایک اور سیاہ ناگ جھاڑیوں میں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ یہ ناگ قد اور رنگ میں مردہ ناگ کے برابر تھا۔ اس مقامی گھڑ سوار کے لبوں پر گہری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "بابو شکاری! آپ نے ناگوں کے جوڑے میں سے ایک ناگ مار ڈالا ہے۔ دوسرے نے آپ کو یہ کام کرتے دیکھ لیا ہے، اب مصیبت آپ پر آئی ہے۔"

میں نے سرنگوں میں داخل ہوتے وقت ایک ڈبل بیرل شاٹ گن بھی اپنے ساتھ لے لی تھی تاکہ سانپ وغیرہ مارا جا سکے۔ کارتوس میں سے بہت بارودی چھرے دائرہ بنا کر نکلتے ہیں، جن سے سانپ وغیرہ کے مرنے کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں جب کہ گولی سے سانپ مارنا ناممکن کے قریب جا پہنچتا ہے۔ البتہ اگر سانپ اپنا پھن پھیلا کر کھڑا ہو تو گولی سے اس کا خاتمہ کرنا قدرے آسان ہو جاتا ہے۔

میں نے فوراً شاٹ گن جھاڑی میں موجود ناگ کی طرف سیدھی کی تو وہ جھاڑی میں چھپ گیا۔ انور اور بھگت بولے "اس ناگ کو تلاش کر کے مار دینا چاہیے۔ اس نے آپ کو اپنا ساتھی مارتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اب یہ آپ کا پیچھا کرتا رہے گا۔"

میں نے کہا "ہاں ایسی صورت میں سانپ اپنے دشمن انسان کا پیچھا کرتے ہیں یا اس کے دوبارہ وہاں آنے کا انتظار بھی سالوں تک کرتے ہیں لیکن میں تو اب کل چلا جاؤں گا۔ ناگ زیادہ سے زیادہ ڈاک بنگلے تک میرا پیچھا کرے گا۔"

ہم ان باتوں میں الجھے ہوئے تھے کہ اچانک دور سے تین گولیاں پے در پے چلیں۔ مجھے فوراً ویول یاد آیا۔ ہم بھاگم بھاگ آواز کی سمت کا تعین کرتے ہوئے چلے۔ ایک جگہ زخمی ویول گھاس پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے پاس ہی مردہ شیرنی پڑی تھی۔ ہم نے ویول کو اٹھا کر گھوڑے پر ڈالا اور مقامی افراد کے ساتھ اسے قریبی شہر کے ہسپتال کی طرف روانہ کیا۔ خود ہم شکاری واپس ڈاک بنگلے میں آ گئے۔ وہاں سے میں نے تار (ٹیلی گرام) بڑے شہر میں محکمہ جنگلات کو بھیجا کہ ویول درندے کا شکار ہونے پر زخمی اور بے ہوش حالت میں ہسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔ کچھ دیر بعد خبر آئی کہ ڈاکٹر نے اس کی زندگی بچ جانے کی توقع ظاہر کی تھی۔ تب ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

شیروں کی کھالیں اتروا کر میں اپنے گاؤں واپس چلا آیا۔ چند ماہ بعد مجھے محکمہ جنگلات نے ٹھہرانے پر مدعو کیا تو وہاں سے پتا چلا کہ ویول کی ایک ٹانگ شیرنی نے یوں چبائی تھی کہ ڈاکٹروں نے اس کی زندگی بچانے کے لئے ٹانگ کاٹ ڈالی۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔

ایک سال بعد مجھے شکار کے سلسلے میں ریاست میسور جانے کا اتفاق ہوا۔ ویول وہاں ہی رہتا تھا۔ میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ سنوکر کھیل رہا تھا۔ اس نے لکڑی کی ٹانگ لگا رکھی تھی جو پتلون میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کی وہیل چیئر پیچھے کھڑی تھی اور اس کی بیساکھی اس کے ساتھ تھی۔ سگار اس کے منہ میں دبا ہوا تھا، وہ ٹیبل پر جھک جھک کر ادھر ادھر حرکت کر رہا تھا۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے اور چہرہ پژمردہ۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔

"آپ سب لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر شیر کے پیچھے نکلے تو میں دم پھولنے سے بے حال ہو چکا تھا۔ مقامی افراد بھی پیدل یا گھوڑوں پر آپ کے پیچھے نکل بھاگے اور میں ستانے لگا۔ سانس میں سانس آتے ہی میں نے اپنا سگار سلگانا چاہا جو بجھ چکا تھا، اچانک مجھے جھاڑیوں میں ایک شیرنی نظر آئی جو مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے فوراً بندوق اس پر تان کر گھوڑا دبایا۔۔۔ گولی بندوق میں پھنس گئی اور میرے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ شیرنی فوراً جھاڑیوں میں روپوش ہو گئی۔ میرے عقب میں قد آور پودوں کا لمبا سلسلہ تھا۔ میں اپنی جان بچانے کے لئے ان پودوں میں گھس گیا۔ کافی دور جا کر میں نے ارد گرد کا جائزہ ذرا سر اٹھا کر لیا۔ شیرنی کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ میں پھر پودوں میں لیٹ گیا اور گن میں سے گولی نکالنے لگا۔ میں اس وقت بہت پریشان تھا۔

میں نے بجھا ہوا سگار پھر سلگا لیا اور گن میں سے گولی نکالنے لگا۔ میں ان افراد میں سے ہوں جو پریشانی میں زیادہ تمباکو پیتے ہیں۔ آخر میں نے گن میں پھنسی ہوئی گولی نکال لی اور باقی گولیاں صاف کر کے دوبارہ اس میں ڈال دیں۔ عین اس وقت مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ شیرنی ایک لمبی جست لگا کر پودے عبور کرتی ہوئی مجھ پر آن گری اور اس نے میری ٹانگ چبا ڈالی۔ وہ سگار کی بو پر مجھے تلاش کر چکی تھی۔ پھر میں نے شدید تکلیف میں جیسے تیسے گن سیدھی کی اور تین گولیاں اس کے سر میں اتار دیں۔ پھر میں ہوش کھوتا چلا گیا۔ اب میں اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہوں۔ نوکری، شکار اور بھاگ دوڑ سب کچھ میں کھو چکا ہوں۔"

پھر وہ خیالوں میں کھو کر زور زور سے سگار پینے لگا۔

"آپ خدا کے واسطے اب ہی یہ زہر چھوڑ دیں۔ باز آئیں، زندہ رہو۔ معذور ہو کر بھی آپ اس جان لیوا عادت بد میں مبتلا ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ یہ سگار مجھے دے دیں گے اور کبھی تمباکو کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ہم اپنی کسی کمزوری کو طاقت بنا سکتے ہیں اور اپنی کسی طاقت کو اتنا استعمال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کمزوری بنے۔"

پھر میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھادیا۔ اس نے سگار مجھے دے دیا۔ میں نے سگار بجھایا اور میز پر پڑا سگاروں کا ڈبا بھی ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ کھانا کھا کر میں وہاں سے رخصت ہوا تو ڈرائنگ روم سے باہر جا کر دبے قدموں واپس پلٹ آیا۔۔۔۔ وہ وہیل چیئر پر سے جھک کر ڈسٹ بن میں سے سگار باہر نکال رہا تھا۔

مگر میں اُمید کرتا ہوں کہ سب بچے خود پر قابو پانا جانتے ہیں اور اپنی عادات بدل سکتے ہیں۔ آپ میں سے کوئی کمزور ویول تو ہرگز نہیں بننا چاہے گا۔

(شکاری عزیز احمد لیل)

دنیا کے دو بہترین کتے

جرمن شیپرڈ اور ڈوبر مین

جرمن شیپرڈ (السیشن)

اسلام میں کتا صرف ضرورت کے تحت رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، فیشن کے طور پر نہیں۔ ضرورت میں حفاظت، شکار اور سراغ رسانی وغیرہ جیسے امور شامل ہیں۔ کئی ممالک میں کتے نابینا افراد کی بھی گھر سے باہر مدد کرتے ہیں۔ کتا ایک وفادار جانور ہے مگر اس میں کچھ جراثیم بھی ہوتے ہیں لہٰذا اسلامی تعلیمات کے مطابق اسے پالنے کے باوجود اس سے فاصلہ رکھنا ضروری ہے، اسے اپنے اوڑھنے بچھونے میں ہی نہیں گھسا لینا چاہیے۔

ڈوبر مین اور جرمن شیپرڈ دنیا کے دو بہترین کتے خیال کیے جاتے ہیں، ان کی یہ خصوصیات ہیں۔

1۔ چوکنے۔ 2۔ طاقت ور۔ 3۔ پرجوش۔ 4۔ چوکی دار۔ 5۔ ذہین۔ 6۔ عقل مند۔ 7۔ اچھی یادداشت کے مالک۔ 8۔ جلد سیکھنے والے۔ 9۔ مضبوط اعضاء کے مالک۔ 10۔ سونگھنے کی صلاحیت سے مالا مال۔

ڈوبر مین پھرتی میں مگر جرمن شیپرڈ سے آگے نکل جاتا ہے کیوں کہ وہ خاصے چست بدن کا مالک ہوتا ہے۔ البتہ ڈوبر مین ابھی پاکستان میں اتنا عام مقبول نہیں جیسے کہ جرمن شیپرڈ۔ جرمن شیپرڈ بھیڑیا نسل کتا ہے۔ انیسویں عیسوی صدی میں اس نسل کا آغاز جرمنی سے ہوا۔ شیپرڈ انگریزی زبان میں چرواہے، گڈریے کو کہتے ہیں۔ اس کی خصوصیات کے بل پر اسے رواج ملا۔ بیسویں عیسوی صدی میں یہ نسل انگلستان میں بھی معروف ہوئی تو اسے عالم گیر جنگ میں السیشن کا نام دیا گیا۔ اب یہ دونوں ناموں سے لکھا اور پکارا جاتا ہے۔ نسل ڈوبر مین کا آغاز بھی انیسویں عیسوی صدی میں جرمنی سے ہوا۔ اس نسل کے کتے اب پوری دنیا میں موجود ہیں۔ یہ کتے شکار، حفاظت اور سراغ رسانی کے علاوہ کھیلوں کے لیے پالے جاتے ہیں۔

(ذیشان قریشی، لاہور)

ڈوبر مین

کوئی روک ٹوک نہیں

عبدالرزاق خان (ڈیرہ اسماعیل خان)

"امی امی۔۔۔ شہریار کے گھر میں جو مالٹے کا درخت ہے ناں! اس۔۔۔ اس میں اتنے پیارے پیارے مالٹے لگے ہیں۔۔۔ امی! ان کے سارے گھر میں مالٹوں کی بھینی بھینی خوش بو پھیلی ہوئی ہے۔۔۔ امی آپ میرے ساتھ چلیں ناں! صرف دو۔۔۔ صرف دو عدد مالٹے۔۔۔ مجھے توڑ کر لادیں۔۔۔" علی گویا ضد کرنے لگا۔

"ارے میرے لعل! وہ اونچے گھرانے کے لوگ ہیں۔۔۔ ہم جیسے غریبوں کا ان کے باغ کے مالٹوں پر کیا حق؟ میرے بچے اس خیال کو دل سے نکال دے۔۔۔ اللہ سے مانگ، وہ ضرور تجھے مالٹے کھلا دے گا۔" علی کی امی اس کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"مگر امی! کیا پتا ان مالٹوں پر میرا نام لکھا ہو۔۔۔ وہ میرے مقدر میں ہوں۔۔۔ آپ میرے ساتھ چلیں تو سہی!" علی نے صفائی پیش کی۔

آخر وہ مان ہی گئیں۔۔۔ ان کے قدم سیٹھ اشرف کے گھر کی جانب اٹھ تو رہے تھے لیکن اجنبیت سی محسوس کر رہے تھے۔۔۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ سیٹھ صاحب جو رشتے میں ان کے دیور لگتے تھے، اپنے بھائی کے مر جانے کے بعد ان کا خیال رکھتے تو آج یہ دن تو نہ دیکھنے پڑتے۔ اچھا بھلا ہنستا بستا گھرانا تھا لیکن اختر کے مر جانے کے بعد آزمائشوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ مشکل گھڑی میں سب ساتھ چھوڑ گئے لیکن زینب بیگم بڑی باہمت اور خود دار خاتون تھیں۔ وہ کرائے کے مکان میں رہ رہی تھیں اور اپنا اور اپنے بچے علی کا پیٹ دوسروں کے کپڑے سی سی کر پال رہی تھیں، کبھی کسی کے آگے انہوں نے دست دراز نہیں کیا۔ خدا کی شان ہے کہ ایسے لوگ کتنے عظیم ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مصیبتیں شکست نہیں دے سکتیں۔ بے شک ایسے بندوں پر اللہ تعالیٰ بھی فخر فرماتے ہیں۔ ان کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن علی کی محبت میں گرفتار وہ سیٹھ اشرف کے گھر چلی جا رہی تھیں۔ بات تو صرف دو مالٹوں کی تھی لیکن اس خود دار خاتون کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔۔۔

تھوڑی دیر میں گھر آ گیا۔۔۔ گھر کیا تھا۔۔۔ محل تھا محل، جہاں خدام کام کاج میں مصروف تھے۔۔۔ یہ دونوں ماں بیٹے سیدھے اس باغ کی طرف چل دیے، جہاں ان کی دیورانی اور بچے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور اسی باغ میں مالٹے کا وہ درخت تھا جس کے صرف دو عدد مالٹے علی کو مطلوب تھے۔

"آؤ زینب! آج کیسے راستہ بھول گئیں؟ بھئی بڑے بھاگ ہمارے کہ آپ تشریف لائی ہیں۔" کشمالہ نے طنزاً کہا۔

زینب کا دل تو چاہ رہا تھا کہ صاف صاف کہہ دے کہ آپ لوگوں نے خود ہی تو ہمیں اپنے سے دور کر رکھا ہے لیکن۔۔۔ اس نے اپنے

جذبات پر قابو پایا اور پھر نرمی سے بولیں: "کشمالہ بہن! بس مصروفیت زیادہ ہے، اس وجہ سے ملاقات میں تاخیر ہو جاتی ہے۔"

"واہ بھئی واہ! غریبوں کی بھی مصروفیت بڑھنے لگی۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ بس ہم ہی مصروف رہتے ہیں۔" کشمالہ نے پھبتی کسی۔

"چلو علی! تمہاری وجہ سے مجھے یہ باتیں سننی پڑ رہی ہیں۔ چلو گھر۔ یہاں اب ایک لمحہ بھی میں نہیں ٹھہر سکتی۔" زینب کو غصہ آ ہی گیا۔

"تو تو زینب! تم اینگری ہونے لگیں۔ اچھا کام تو بتاؤ، کیسے آنا ہوا؟؟"

اپنی امی کے بولنے سے پہلے علی ہی بول پڑا "آنٹی!" "میں آپ لوگوں کے درخت سے مالٹے توڑنا چاہتا ہوں۔۔۔ صرف دو عدد۔"

"ہوئے میری مما کو آنٹی مت کہو غریب کہیں کے!" کشمالہ کے بگڑے ہوئے فرزند شہریار نے اٹھ کر علی کو گریبان سے پکڑتے ہوئے کہا۔

کشمالہ بولی "چھوڑ دو بیٹا اسے! یہ غریب یتیم ہے۔۔۔ توڑنے دو اسے مالٹے۔۔۔ کر لینے دو خواہشیں پوری!"۔۔۔ "تو مما! اس کے منحوس ہاتھ میں اپنے درخت پر نہیں لگنے دوں گا۔" شہریار چیخا۔

زینب بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ علی کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چل دیں اور علی میاں پر تو مالٹوں کا بھوت سوار تھا، وہ مڑ مڑ کر درخت پر لگے مالٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس پر تو جیسے شہریار کی باتوں کا اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ اس بے چارے کو تو صرف دو عدد مالٹے چاہیے تھے۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ شہریار لوگ اس کے ساتھ ایسا سلوک کریں گے۔ گھر سے باہر نکلتے نکلتے اس نے آخری بار پھر مالٹے کے درخت کو دیکھا جو گویا رو رو کر یہ کہہ رہا تھا "صبر کرو علی! اللہ ظلم کرنے والوں کو کبھی بامراد نہیں کرتا۔"

زینب بیگم اپنے کو ملامت کر رہی تھیں کہ علی کی اتنی چھوٹی سی خواہش کے پیچھے اتنی باتیں سننا پڑیں۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ نیند علی کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کی امی اس کے سر کے بالوں میں بار بار پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ وہ طرح طرح کے سوالات کر رہا تھا اور وہ بے چاری اپنے تئیں کوشش کر رہی تھیں لیکن ان کے جوابات سے علی مطمئن نہیں تھا۔ آخر علی بولا۔ "امی! دنیا والے ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ابو کے فوت ہو جانے کے بعد سب نے ہم سے کیوں منہ موڑ لیا اور آج تو اشرف چچا کے گھر والوں نے مجھے مالٹے بھی نہیں توڑنے دیے، صرف دو عدد۔" زینب کو اپنے میاں رہ رہ کر یاد آ رہے تھے۔ آخر وہ بولیں: "علی بیٹا! سو جاؤ رات کافی ہو چکی ہے۔ صبح فجر کی نماز کے لئے بھی اٹھنا ہے۔"

وہ سوچتا ہی رہا اور رات کے کسی پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کا چہرہ نور سے چمک رہا تھا اور اس کی پیاری پیاری بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے نم تھیں۔ حال آں کہ اس عمر میں خوشیوں کے سوا کوئی غم ہوتا ہی نہیں لیکن اپنوں کی بے وفائی نے آج اس ننھے سے علی کو اشک بار کر دیا تھا۔ خواب میں علی کو اس کے ابو ملے جو روڈ ایکسیڈنٹ میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ وہ علی کو پیار سے دیکھ کر پوچھنے لگے۔۔۔

"علی بیٹا! میں تمہیں اداس دیکھ رہا ہوں اور یہ کیا تمہاری آنکھوں میں آنسو؟ کیوں کیا اشرف چاچو تمہارا خیال نہیں رکھتے۔۔۔؟" علی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔۔ "نہیں ابو! سب ہمیں چھوڑ گئے۔۔۔ اور ابو! آج تو شہریار نے مجھے دو مالٹے بھی نہیں توڑنے دیے۔" علی کے ابو نے اسے سینے سے لگایا اور پیار کرتے ہوئے کہا:

"بیٹا! کوئی پروا نہیں۔ اللہ تو تمہارے ساتھ ہے ناں! بس اسی پر بھروسا کرنا۔ وہ تمہیں کبھی بھی ناکام نہیں کرے گا اور نہ کسی مشکل گھڑی میں تمہارا ساتھ ہی چھوڑے گا۔ بس تم اس کے ساتھ وفا کرنا۔ اور رہے مالٹے۔ تو ان کے پیچھے تم مت روؤ۔ یہ لو مالٹے۔ یہ ایسے باغات کے ہیں، جہاں کوئی روک ٹوک نہیں اور نہ یہ پھل ختم ہی ہوں گے۔" علی نے وہ مالٹے اپنے ابو سے لیے تو اس سے تو اٹھائے بھی نہیں جاتے تھے۔ مالٹے کیا تھے، بڑے بڑے مٹکے تھے۔ اس کے ابو اسے پیار کر کے جانے لگے اور وہ بڑی میٹھی میٹھی آواز میں قرآن پاک کے الفاظ تلاوت کر رہے تھے۔

ترجمہ: جنت کے پھل نہ ختم ہی ہوں گے اور نہ روکے ہی جائیں گے۔

علی کی جوں ہی آنکھیں کھلیں تو نہ تو اس کے ابو موجود تھے اور نہ وہ بڑے بڑے خوب صورت خوش بودار مالٹے ہی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ ادھر موذن پکار رہا تھا "حی علی الفلاح" علی بستر سے اٹھا اور سیدھا مسجد کی جانب دوڑا۔ نماز کے بعد قاری صاحب کو اس نے اپنا یہ خواب سنایا۔ وہ بے حد مسرور ہوئے اور کہنے لگے۔ "بھئی واہ علی میاں! تم نے تو جنت کے مالٹے دیکھ لئے۔ "لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "جنت کے پھل دائمی ہوں گے، یہ کبھی ختم نہ ہوں گے، نہ ان کو توڑنے سے ہی کوئی روکے گا اور ان پھلوں کو کھانے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی۔

اب علی خوشی خوشی اپنے گھر آ رہا تھا کیوں کہ اس کے دل سے دنیا کے اور جنت کے بڑے بڑے مالٹوں کا خیال بھی نکل گیا تھا۔ اب تو اس پر بس ایک ہی دھن تھی کہ اللہ کو خوب راضی کر لے۔۔۔۔

سنہرے اقوال

تین چیزیں زندگی میں ایک بار ملتی ہیں۔ والدین، مہلت، جوانی۔
تین چیزیں سوچ سمجھ کر اٹھاؤ۔ قدم، قسم، قلم۔
تین چیزیں سوچ کر کرو۔ دوستی، بات، فیصلہ۔
تین چیزیں کسی کا انتظار نہیں کرتی۔ موت، وقت، عمر۔
تین چیزیں چھوٹی نہ سمجھو۔ قرض، فرض، مرض۔
(حضر حیات، محمد نعمان، تصدق حسین، روڈا تھل)

معلومات

مشہور تفسیر "ضیاالقرآن" پیر محمد کرم شاہ الازہری نے لکھی۔
"صحاح ستہ" حدیث کی چھ صحیح ترین کتب کو کہا جاتا ہے۔
حضرت داتا گنج بخش کا اصل نام "سید علی بن عثمان ہجویری" تھا۔
بلوچستان کے شہر زیارت کو "پاکستان کا سوئٹزرلینڈ" کہا جاتا ہے۔
بادشاہی مسجد (لاہور) اورنگ زیب عالم گیر نے بنوائی تھی۔
(محمد صادق سومرو، بلوچستان)

عقل

ماضی نے انسان سے کہا "تو مجھے یاد کر، میں تیری زندگی بنا دوں گی۔" حال نے رعب دار آواز میں کہا "تو ماضی کو چھوڑ اور یہ دیکھ کہ آج کیا ہو رہا ہے" مستقبل نے بیچ میں دخل دیا "تو یہ خیال نہ کر کہ آج کیا ہو رہا ہے اور کل کیا تھا۔ آج کی زندگی تو گزر جائے گی۔ تو آنے والے کل کی سوچ اور ایسا عمل کر کہ میں تیرے لیے روشن ہو جاؤں۔" عقل نے ان سب کو ہٹاتے ہوئے کہا: "اے انسان اگر تو کام یابی چاہتا ہے تو تینوں کو پیش نظر رکھ کر زندگی گزارنا۔ (طیبہ رشید، جلال پور ضلع گجرات)

زندگی کی گاڑی

اگر آپ زندگی کی گاڑی کام یابی کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں تو آپ کو دل کے ایکسی لی ریٹر پر قابو پانا ہو گا۔ دماغ کے بریک مضبوط رکھنا ہوں گے اور غصے کی سپیڈ کو کنٹرول میں رکھنا ہو گا۔ اپنی طرف سے اونچی اور اچھی کوالٹی والے ٹائر لگوانے ہوں گے تاکہ آپ کے خیالات کا ٹیوب پنکچر ہونے سے بچا رہے۔ آنکھوں کی ہیڈ لائٹس میں خلوص کی روشنی ہونی چاہیے۔ طبیعت کی ڈکی کو وسیع رکھنا ہو گا۔ زبان کے سپیڈو میٹر میں خوش اخلاقی کی رفتار ہو۔ تب جا کر آپ دنیا کے روڈ پر اپنی زندگی کی گاڑی آسانی سے ڈرائیو کر سکیں گے۔ (سید محمد رحیم شاہ، واہ کینٹ)

سچ سچ

پورے ملک میں یہ بحث جاری تھی کہ بچوں کا محبوب رسالہ کون سا ہے۔ آخر کار یہ فیصلہ کیا گیا کہ پورے ملک میں الیکشن کرا لیا جائے۔ ووٹنگ کا دن 10 مئی مقرر کیا گیا اور ووٹنگ کی جگہ لاہور مقرر کی گئی۔ آخر کار 10 مئی کا دن آ پہنچا اور صبح 8 بجے سے لے کر شام پانچ بجے تک ووٹنگ بغیر کسی ہنگامے کے جاری رہی، جس میں دس کروڑ 60 لاکھ بچوں نے پورے ملک سے آ کر ووٹ ڈالے۔ آخر کار 5 بجے سے لے کر 7 بجے تک ووٹوں کی گنتی کی گئی اور آٹھ بجے رات کو چیف الیکشن کمشن آف پاکستان نے نتائج کا اعلان کیا گیا تو سب حیران رہ گئے کہ تعلیم وتربیت نے سب سے زیادہ یعنی دس کروڑ 59 لاکھ 37 ہزار 3 سو 27 ووٹ حاصل کیے تھے۔ اب تو سب کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ تعلیم وتربیت سچ مچ ہی بچوں کا محبوب رسالہ ہے اور رہے گا، ان شاء اللہ۔
(محمد منظر بلال حسین، سمندری)

نیک عادت

ایک بزرگ نہر کے کنارے بیٹھے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک کیڑا پانی میں ڈوب رہا ہے۔ بزرگ کو اس پر بہت ترس آیا۔ انہوں نے اسے باہر نکالا ہی تھا کہ اس نے ان کے ہاتھ پر کاٹا اور میں پانی میں گر گیا انہوں نے اسے دوبارہ باہر نکالا تو کیڑے نے بھی دوبارہ کاٹا۔ یہ عمل جب کافی دیر تک چلتا رہا تو پاس کھڑے شخص نے کہا "یہ کیڑا بڑا بدبخت ہے، اسے چھوڑ دیں۔" تو بزرگ نے جواب دیا "اگر کیڑا اپنی بری عادت نہیں چھوڑتا تو میں اپنی نیک عادت کیوں چھوڑوں۔" (محمد سعد عارف بلوچ، ایبٹ آباد)

امی جان نے چند کرنسی نوٹ وجاہت کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"ایک کلو گرام آلو، پانچ روپے کا ہرا دھنیا، ایک کلو گرام پیاز، چھ انڈے اور آدھی ڈبل روٹی لے آؤ۔"

"اتنی چیزیں میں یاد نہیں رکھ سکتا، لکھ کر دیں۔" وجاہت بولا۔

"اچھا بھئی کاغذ پر لکھ دیتی ہوں۔"

کچھ دیر بعد امی جان کی لکھی ہوئی فہرست وجاہت کے ہاتھ میں تھی۔

"بس جلدی سے یہ چیزیں لے آؤ، ہر چیز دھیان سے خریدنا، سیدھے گھر آنا، پیسے سنبھال کر رکھنا۔"

امی جان کی باتیں سن کر وجاہت بولا۔

"میں بازار تک تو جا رہا ہوں، آپ تو اس طرح سمجھا رہی ہیں، جیسے میں کسی دوسرے ملک جا رہا ہوں۔۔۔ میں پہلے بھی کئی بار سامان لاتا رہا ہوں، کبھی خراب چیز لایا ہوں؟"

امی جان کے بولنے سے قبل آپی نے برآمدے سے اونچی آواز میں کہا۔ "باسی ڈبل روٹی۔"

"میں ایک دفعہ باسی ڈبل روٹی کیا لایا، امی جان! آپی تو میری اس غلطی کو پکڑ کر بیٹھ گئی ہیں۔"

"فائزہ! تم چپ رہو، جاؤ بیٹا جاؤ، جلدی سے آجانا۔" امی جان بولیں۔

اختر کالونی میں آباد یہ گھرانہ چار افراد امی، ابو، فائزہ اور وجاہت پر مشتمل تھا۔ وجاہت کے ابو شجاعت پچھلے پانچ سال سے ملازمت کے سلسلے میں دوحہ میں مقیم تھے۔ سال میں ایک مرتبہ وہ پاکستان آتے تھے۔ یوں تو امی جان مہینے کے آغاز میں گھریلو اشیاء اکٹھی لے آتی تھیں مگر چھٹی کے دن کبھی کبھار بارہ سالہ وجاہت کو کچھ سامان لینے کے لیے بازار بھیج دیتی تھیں۔ ان کا ایسا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وجاہت کو خریداری کا تجربہ ہو جائے۔

وجاہت گھر سے نکل کر بڑی سڑک کے قریب پہنچا تو اس کا ہم جماعت محسن اسے مل گیا۔ "کہاں جا رہے ہو؟" وجاہت نے پوچھا۔

"میلے میں جا رہا ہوں، تم بھی میرے ساتھ چلو۔" محسن نے کہا۔

"میں تو گھر سے سامان لینے آیا ہوں۔"

"سامان بھی لے لینا، بس آجاؤ میرے ساتھ، میں پرسوں بھی میلے میں آیا تھا، قسم سے بہت مزہ آیا تھا، آجاؤ۔"

وجاہت محسن کی باتوں میں آگیا۔

"میں زیادہ دیر میلے میں نہیں ٹھہروں گا۔" وجاہت بولا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ تھوڑی دیر ہی وہاں ٹھہرنا، یہ دیکھو میرے پاس

پانچ سو روپے ہیں۔" محسن نے اپنی جیب سے پانچ سو روپے کا کرنسی نوٹ نکال کر وجاہت کو دکھایا۔

"میرے پاس بھی روپے ہیں مگر۔۔۔" وجاہت نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"مگر کیا؟"

"میں یہ روپے خرچ نہیں کر سکتا، میں نے ان روپوں سے سامان لے کر گھر جانا ہے۔"

"تم فکر کیوں کرتے ہو، میلے میں پیسے میں خرچ کروں گا۔" محسن بولا۔

ان ہی باتوں میں مصروف دونوں توحید پارک پہنچے، جہاں جشن بہاراں کے سلسلے میں ایک بڑے میلے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میلے میں موت کا کنواں، سرکس، میوزیکل تھیٹر، کھلونوں کی عارضی دکانیں، کھانے پینے کے سٹالز، جھولے الغرض بہت کچھ تھا۔ وہ ہنسی گھر میں ٹکٹ لے کر داخل ہوئے، جہاں پر ہر طرف بڑے بڑے آئینے رکھے گئے تھے۔ ان آئینوں کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں دیکھنے سے کسی کے کان بڑے ہو جاتے تھے اور کسی کی ناک، دونوں اب آئینوں کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں اپنی شکلیں آئینے میں دیکھتے ہوئے ہنس رہے تھے۔

"وجاہت! تمہارے کان تو گدھے کی طرح لمبے ہو گئے ہیں۔"

"اپنی ناک تو دیکھو۔" وجاہت بولا۔

"دیکھو اس آدمی کے دانت تو ڈریکولا کی طرح لمبے ہو گئے ہیں۔" محسن مسکرا کر بولا۔

وہ کافی دیر وہاں سب کی شکلیں دیکھ دیکھ کر ہنستے ہنساتے رہے۔

پھر محسن وجاہت کا ہاتھ پکڑ کر ایک بڑے دائرے کی طرف بڑھا۔ دونوں ایک طرف کھڑے ہو گئے، وہاں بندر کا تماشا ہو رہا تھا۔ بندر نچانے والے کے ایک ہاتھ میں ڈگڈگی اور دوسرے ہاتھ میں بندر کی رسی تھی۔ بندر والا ڈگڈگی بجاتے ہوئے مسلسل بول رہا تھا۔

"مہربان! قدر دان! بندر اب چلا رہا ہے بائی سائیکل، میرے پیارے بندر! اب بائی سائیکل چلا کر دکھاؤ۔" یہ کہہ کر بندر والے نے بندر کی رسی کھینچی تو وہ زمین پر لیٹ کر ٹانگیں اوپر کر کے بائی سائیکل کے پیڈل چلانے کی طرح آگے پیچھے اپنی ٹانگیں چلانے لگا۔

"واہ بھئی واہ۔۔۔ بندر بائی سائیکل چلا رہا ہے۔ واہ بھئی واہ۔۔۔ بچو لوگ تالی بجاؤ، زور سے تالی بجاؤ۔"

وجاہت نے اپنی گلی میں تو بندر کا تماشا دیکھا تھا مگر اتنے بڑے مجمع میں پہلی بار اسے بندر کا تماشا دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

"میرا بندر اب بابو بنے گا، چل بندرا بن جا بابو اور جا دفتر۔" بندر والے نے ڈگڈگی بجاتے ہوئے کہا۔

بندر ہاتھ کمر پر باندھے اکڑ اکڑ کر چلنے لگا۔

"آہا۔۔۔ آہا بابو دفتر جا رہا ہے۔۔۔ بچو لوگ تالی بجاؤ۔"

دائرے کی شکل میں کھڑے بچے بوڑھے سب ہی بندر کی اداکاری پر تالیاں بجانے لگے۔ بندر کے بعد بکرے اور کتے نے اپنے کرتب دکھا کر لوگوں کو محظوظ کیا۔ بندر کا تماشا اس قدر دلچسپ تھا کہ دونوں اس میں محو ہو کر رہ گئے تھے۔ جب یہ تماشا ختم ہوا تو محسن وجاہت کا ہاتھ پکڑ کر مٹھائی کی دکانوں کی طرف لے گیا۔

"بولو کیا کھاؤ گے، قلاقند، گلاب جامن یا جلیبیاں۔"

"قلاقند کھا لیتے ہیں۔" وجاہت بولا۔

دونوں قلاقند کھاتے ہوئے موت کے کنویں کے پاس پہنچے۔ اونچے چبوترے پر بیٹھا ایک شخص ٹکٹ بیچ رہا تھا جبکہ ایک آدمی لاؤڈ سپیکر پر مسلسل اعلان کرنے میں مصروف تھا۔

"موت کے کنویں میں دو موٹر سائیکل سواروں کے خطرناک کرتب دیکھیں، پاکستان میں پہلی بار بیک وقت دو موٹر سائیکل سوار اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ شو شروع ہونے والا ہے۔ جلدی کریں ٹکٹ لے لیں، تھوڑی دیر میں شو شروع ہونے کو ہے۔" یہ اعلان ختم ہوتے ہی ایک فلمی گیت فضا میں گونجنے لگا۔ وجاہت نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو امی جان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی سامان کی پرچی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کبھی موت کا کنواں نہیں دیکھا تھا۔ محسن نے دو ٹکٹ لیے اور اسے بازو سے پکڑ کر کہا۔ "آؤ اوپر چلتے ہیں۔"

وجاہت پرچی جیب میں رکھ کر لکڑی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے محسن کے ساتھ موت کے کنویں کے اوپر پہنچ گیا۔ تماشائیوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ وجاہت نے کنویں میں جھانکا تو دو نوجوان کولڈ ڈرنک پینے میں مصروف تھے۔ دس منٹ کے بعد شو شروع ہونے کا اعلان ہوا۔ ایک نوجوان نے کولڈ ڈرنک کا لمبا گھونٹ لیا اور موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے اس پر بیٹھ گیا۔ موٹر سائیکل کا سائلنسر نہ ہونے کے

باعث آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ دوسری موٹر سائیکل کے سٹارٹ ہونے پر اس آواز میں مزید اضافہ ہو گیا۔ موٹر سائیکل سوار برق رفتاری کے ساتھ لکڑی کے تختوں سے بنے موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے لگے۔ لکڑی کا کنواں بری طرح ہل رہا تھا۔ تماشائی شور مچا کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے جب کہ خوف کے مارے وجاہت کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ پھر ایک ہوٹل سے پیٹ بھر کر تیس منٹ بعد دونوں ایک سرکس کے سامنے کھڑے تھے۔ محسن کی جیب میں دو سو روپے بچے تھے، سرکس کا ٹکٹ ڈیڑھ سو روپے کا تھا۔

"میں سرکس کا ٹکٹ خود لے لیتا ہوں۔" وجاہت نے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر تو مسئلہ حل ہو گیا ہے۔"

ٹکٹ لے کر دونوں سرکس کے پنڈال میں داخل ہوئے۔ شیر، ہاتھی اور بندروں کے کرتبوں سے پہلے دو جوکر اپنی حرکتوں سے لوگوں میں خوشیاں بانٹ رہے تھے۔ جب ایک آدمی شیر کو لیے پنڈال میں داخل ہوا تو ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ جب اس شخص نے اپنا ہاتھ شیر کے جبڑے میں دیا تو لوگ دم بخود رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آدمی شیر پر سوار ہو گیا۔ جنگل کا بادشاہ اپنے مالک کے ہر اشارے کو سمجھ رہا تھا۔ شیر کے بعد ہاتھی کے آتے ہی پنڈال میں موجود بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ ایک موٹا آدمی زمین پر لیٹا تو ہاتھی نے اپنے اگلے پاؤں اس کی چھاتی پر رکھ دیئے۔ ایسے کرتب میں ہاتھی کی تربیت کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ پاؤں کا وزن آدمی پر نہیں ڈالتا، صرف اس کے اوپر رکھتا ہے۔ بہر حال یہ ایک خطرناک کرتب تھا۔ ہاتھی کے دونوں پاؤں کے وزن کی وجہ سے زمین پر لیٹے آدمی نے ہلکی سی چیخ بلند کر کے ڈراما کیا۔ اس خطرناک کرتب کے بعد بندر اپنی شرارتوں سمیت پنڈال میں موجود تھے۔ ایک بچہ کیلا کھا رہا تھا کہ ایک بندر اس سے کیلا چھین کر لے گیا۔ کچھ لوگ کھانے پینے کی چیزیں بندروں کی طرف اچھال رہے تھے اور بندر چھلانگیں لگا لگا کر ان چیزوں کو پکڑ رہے تھے۔ "میرے پاس اپنا ویڈیو کیمرا ہوتا تو میں اس منظر کو اس میں محفوظ کر لیتا۔" وجاہت نے بندروں کو شرارتیں کرتے دیکھ کر محسن سے کہا۔

وجاہت جب گھر سے نکلا تھا تو تب عصر کا وقت تھا۔ اب مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ اسے امی جان کی کوئی بات بھی یاد نہیں رہی تھی۔ وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ وہ میلے کی رونق میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کبھی بھی اس میلے سے باہر نہ جائے۔ رات کے وقت روشنیوں نے میلے کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اب دونوں اس جگہ موجود تھے، جہاں لوگ بھاری وزن اٹھا کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس دوران ایک ہاتھ نے محسن کی گردن پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ محسن نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کے ابو جان غصے سے بھرے اس کو گھور رہے تھے۔

"کم بخت! میری جیب سے پیسے چرا کر میلے میں آ گئے ہو، لاؤ پیسے کہاں ہیں؟"

"وہ تو میں نے اور وجاہت نے خرچ کر لیے ہیں۔"

"کون وجاہت؟"

"ہاں یہ میرا دوست ہے۔"

اس سے پہلے کہ محسن کے ابو جان وجاہت کو بھی پکڑتے، وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ چند منٹوں ہی میں وہ میلے سے دور جا چکا تھا۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ کے باعث گلیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا کہ ایک کھلے مین ہول میں گر پڑا۔ اس کے چیخنے چلانے پر دو لڑکے اس کی مدد کے لیے اس کی طرف لپکے۔ اس کے بازو پر معمولی سی چوٹ لگی تھی۔ کیچڑ سے اس کے کپڑے خراب ہو گئے تھے۔ "بچ گئے ہو بھائی!"

"میں ٹھیک ہوں، بازو پر معمولی سی چوٹ لگی ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔"

روشن پورا بھی روشنی نہ ہونے کے باعث اندھیرے کی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ وجاہت نے ایک نل کے پانی سے کپڑوں سے کیچڑ صاف کی۔ اس نے ہاتھ منہ دھو کر جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ خالی تھی۔ میلے میں کسی نے اس کے پیسے اور سامان کی لسٹ نکال لی تھی۔ خوف نے اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اس کے لیے گھر واپس جانا مشکل تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ اس وقت تو وہ کھانا کھا کر سو جاتا تھا۔ ایک بزرگ کے دربار پر ایک آدمی چاول بانٹ رہا تھا۔ چاول کی خوش بو سے وجاہت کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ اس نے چاول کھا کر نل سے پانی پیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ مزار کی سیڑھیوں کے پاس ڈھول بج رہا تھا۔ وجاہت سیڑھیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چوں کہ یہ اس کے سونے کا وقت تھا اس لیے ڈھول کے شور کے باوجود اس کی آنکھ لگ

چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ اپنے ہم عمر بچوں کو دیکھ کر وجاہت کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سب ہی اپنے اپنے گھروں سے سامان لینے نکلے ہوں اور میلے کی رونق میں گم ہو کر گھر نہ جانے پر واپسی کا راستہ بھول گئے ہوں۔ وجاہت نے دیوار سے ٹیک لگائے ایک بچے سے پوچھا۔

"تم یہاں کیسے پہنچے ہو؟"

"میری ماں نے صبح مجھے سکول نہ جانے پر ڈنڈے سے اتنا مارا کہ میرے جسم پر نیل پڑ گئے۔ میں اب گھر واپس نہیں جاؤں گا، میری ماں مجھے مارے گی۔"

"سارا دن میں نے کرکٹ میچ کھیلا، اب میں ورک شاپ نہیں جاؤں گا، استاد لوہے کے راڈ سے میری پٹائی کرے گا۔" دروازے کے ساتھ بیٹھا بچہ بھی چلانے لگا۔

تھوڑی دیر میں وجاہت کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سب بچے کسی نہ کسی گم راہی اور مار کا شکار ہو کر گھروں سے بھاگے ہیں۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اسے گھر میں کبھی بھی کسی سے مار نہیں پڑی۔ سب اس سے پیار کرتے ہیں۔ پھر تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔ گھر سے نکلنے سے لے کر اب تک کی ایک ایک بات اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کر رہی تھی۔ وہ اس کم زور لمحے کو کوس رہا تھا، جب وہ محسن کی باتوں میں آیا تھا۔ اگر وہ محسن کی باتوں میں نہ آتا تو اس وقت گھر کے نرم بستر پر نیند کے مزے لوٹ رہا ہوتا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ مچھر کانوں کے پاس آ کر آوازیں نکال نکال کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ جب بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے باعث کمرا اندھیرے میں ڈوب گیا تو وجاہت سمیت سب ہی بچے چیخنے چلانے لگے۔ چند منٹوں بعد کمرے میں موم بتی روشن کی گئی تو یہ چیخ و پکار ختم ہوئی۔ وجاہت نے

گئی۔ وہ کافی دیر تک وہاں سوتا رہا۔ جب وقت گزرنے کے ساتھ بھیڑ کم ہوئی تو بچوں کی ایک فلاحی تنظیم کے ایک آدمی "ناظم" نے اس کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "اٹھو، آنکھیں کھولو، اٹھو۔"

وجاہت گہری نیند میں تھا۔ اسے پتا نہیں چل رہا تھا کہ کوئی آدمی اس سے مخاطب ہے۔

"بیٹے! آنکھیں کھولو، بتاؤ تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"مجھے سونے دو، مجھے سونے دو"۔ وجاہت غنودگی کی حالت میں بڑبڑایا۔

"لگتا ہے گھر سے بھاگا ہوا ہے، اٹھا کر گاڑی میں ڈالو اسے۔" ناظم نے اپنے ساتھی امجد کو مخاطب کیا۔

امجد جب وجاہت کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے لگا تو ایک دم اس نے آنکھیں کھول دیں اور شور مچانے لگا۔ "مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔"

وجاہت کے شور میں گاڑی دربار کے ساتھ والی سڑک سے گزر کر مین روڈ پر آ گئی۔ نیند وجاہت کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ گاڑی ریلوے پھاٹک کو عبور کر کے ایک عمارت میں داخل ہوئی جس کے مین گیٹ پر بچوں کی فلاحی تنظیم "مددگار" کے مرکزی دفتر کا بورڈ آویزاں تھا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں فرش پر بچھی چٹائی پر چھ سات بچے چہروں پر اداسی سجائے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ امجد کمرے میں وجاہت کو

ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ گھر سے باہر یہ رات وجاہت سے کاٹے نہ کٹتی تھی۔ اس پر ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے دن کا اجالا رات کے اندھیرے پر غالب آیا تو ایک ادھیڑ عمر شخص "اقبال" ہاتھ میں رجسٹر لیے کمرے میں آیا۔ اس نے باری باری سب بچوں سے ان کے نام اور گھر کے پتے معلوم کیے۔ کچھ بچے خاموش رہے اور کچھ نے سب کچھ اقبال کو سچ سچ لکھوا دیا۔ جب وجاہت کی باری آئی تو اس نے حرف بہ حرف اپنی کہانی سنادی۔ "کیا گھر جانا چاہتے ہو؟"

"میں اس جگہ نہیں رہ سکتا، مجھے اپنے گھر جانا ہے، جہاں میری پیار کرنے والی ماں اور میری اچھی سی آپی ہے، میں گھر جاؤں گا۔"

اقبال نے بچوں کو بتایا کہ انہیں اس کمرے میں تنہا اس لیے رکھا گیا تھا تاکہ وہ گھر اور گھر سے باہر کے ماحول کا فرق محسوس کر سکیں۔ پھر وجاہت کے بتائے ہوئے نمبر پر رابطہ کیا تو وجاہت کے ماموں سے اقبال کی بات ہوئی۔

کچھ کاغذی کارروائی کے بعد ماموں وجاہت کو گاڑی میں بٹھا کر گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ وجاہت کا سر شرمندگی سے جھکا ہوا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ امی جان اور آپی کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا۔ وجاہت کی آنکھیں امی جان کو تلاش کر رہی تھیں۔

"امی جان کمرے میں تمہارے غم میں نڈھال نیم بے ہوش پڑی ہیں۔" آپی بولیں۔ وجاہت کو اپنے سامنے دیکھ کر امی جان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ وجاہت نے امی جان کے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

"امی جان! مجھے معاف کر دیں، میں نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے۔"

پھر وجاہت نے روتے روتے سب کچھ بتا دیا۔ امی جان کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ "میرے بیٹے! مجھے بتاتے، میں خود تمہیں میلے میں لے کر جاتی۔ میری ایک بات پلے سے باندھ لو۔ اس بات کو ہمیشہ یاد بھی رکھنا اور اس پر عمل بھی کرنا۔"

"بولیے امی جان! میں سن رہا ہوں۔"

"بیٹا! زندگی ایک میلا ہے۔ زندگی کے اس میلے میں قدم قدم پر بہت سی چیزیں انسان کے قدم جکڑتی ہیں مگر وہی لوگ اپنی مراد پاتے ہیں جو نہ اپنے مقصد سے نظر ہٹاتے ہیں اور نہ کسی کی باتوں میں آکر اس میلے کی رونق میں گم ہوتے ہیں۔"

"امی جان! میں یہ بات یاد بھی رکھوں گا اور اس پر ہر لمحہ عمل بھی کروں گا۔ آپ بس ایک مرتبہ مجھے معاف کر دیں۔" وجاہت کی یہ بات سن کر امی جان نے اس کو اپنی آغوش میں چھپا لیا جہاں اس کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ ☆

گڑیا اور اعلیٰ مقاصد

یہ تقسیم ہند سے پہلے کی بات ہے۔ ہمارا گاندھی خاندان انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لے رہا تھا۔ ہم نے عوام کو ترغیب دی کہ وہ تمام تر انگریزی مصنوعات ترک کر دیں، جلا کر راکھ کر دیں، اپنے وطن سے محبت کریں اور تحریک آزادی پر ہی تمام تر توجہ مرکوز رکھیں۔ اسی سلسلے میں ہم نے شہر میں آگ جلائی اور اپنا انگریزی سامان، کھلونے کپڑے سب کچھ نذر آتش کر دیا۔ سارا شہر امڈ پڑا لوگ قیمتی انگریزی کپڑے اور سامان اس الاؤ میں پھینک رہے تھے..... مگر میں نے اپنی پیاری گڑیا آگ میں نہیں پھینکی۔

میں اس وقت چھوٹی سی تھی اور یہ انگریزی گڑیا مجھے ایک رشتہ دار نے تحفہ دی تھی جو مجھے تمام کھلونوں میں سے عزیز تھی۔ میں کئی دن گڑیا کی چاہت اور وطن کی محبت کے بیچ تڑپتی رہی۔ آخر میں نے ایک دن فیصلہ کر لیا۔ میں نے چھت پر جا کر گڑیا جلا دی اور اپنے وطن، تحریک کا ساتھ دے کر خاندان بھر سے داد وصول کی۔

وہ دن اور آج کا دن، مجھے زندگی میں کسی اعلیٰ مقصد کی خاطر قربانی دیتے وقت کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی، میں فوراً فیصلہ کرتی ہوں۔ قربانی دینے سے تکلیف تو ہوتی ہے مگر زندگی کے اعلیٰ مقاصد بھی تو حاصل ہوتے ہیں۔ جو ہمیں بڑا انسان، بڑی قوم بناتے ہیں۔

(ایک سابق بھارتی حکمران آنجہانی اندرا گاندھی کی سوانح عمری "میرا سچ" سے اقتباس)

پُراسرار ناخن

قسط 3

نئے قارئین کے لیے.......

اس کہانی کا مرکزی کردار ایک جاسوس نوجوان ہے جو سیٹھ حشمت کے بنگلے میں ان کے قتل کا سراغ پولیس اور صحافیوں کی موجودگی میں لگا رہا ہے۔ اسے وہاں سے ایک سنہری ناخن بھی ملتا ہے۔ وہ اب سیٹھ کے فیملی فزیشن ڈاکٹر عاطف سے معلومات حاصل کر رہا ہے۔

"مجھے نہیں معلوم! مجھے نورین نے بتایا تھا کہ اس کے ابو دوسری امی سے لڑتے ہیں۔ میں نے سیٹھ صاحب سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ ٹال گئے۔ مگر پھر میں نے بھی دیکھا کہ وہ شریفہ بیگم سے اکھڑے اکھڑے سے تھے۔" ڈاکٹر عاطف نے کہا۔

"سیٹھ صاحب نے آپ کو اور چوکی دار کو کیا اپنے ذاتی کمرے میں بلاکر وصیت نامے پر دستخط لئے تھے یا کہیں اور؟" میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں، اپنی وصیت پر انہوں نے اسی کمرے میں لے جاکر ہمارے دستخط لئے تھے کہ انہوں نے اسے وہیں رکھا تھا۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ وہ چوکی دار پر بھی بھروسا کرتے تھے۔"

"آپ یہ نہیں کہہ سکتے، دراصل آپ کو سیٹھ صاحب کی فطرت اور عادات کے بارے میں علم نہیں۔ نوکروں کو وہ صرف نوکر سمجھتے تھے، عقل سے پیدل اور صرف سر جھکا کر کام کرنے والے۔ ان کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ چوکی دار یہ بات کسی اور کو بتائے گا۔" کچھ دیر رک کر انہوں نے کہا، "سیٹھ صاحب جیسے لوگ صرف انہی لوگوں کو انسان سمجھتے ہیں، جو ان کے مطابق، کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں یا پھر ان کے ہم پلہ ہوں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں؟"

ہم دونوں نے سر ہلایا۔ میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور میں نے ڈاکٹر عاطف سے پوچھا، "شریفہ بیگم کیا بہت عیش پرست۔۔۔ میرا مطلب۔۔۔"

"جی ہاں، جی ہاں، میں سمجھ رہا ہوں۔" انہوں نے میری بات اچک لی۔ "آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں، شریفہ بیگم کو اسراف کا بہت شوق ہے۔ خصوصاً سونے اور ہیرے کے زیورات کا ان کو جنون ہے۔ سب سے خاص چیز ان کے وہ سونے کے ناخن ہیں جو انہوں نے اپنے لئے بنوائے ہیں اور جن کو وہ بہت عزیز رکھتی ہیں۔" میں نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پایا۔

"آیئے اندر چلتے ہیں۔" ڈاکٹر عاطف نے کہا، "دھوپ بہت تیز ہو رہی ہے۔" کچھ دیر کے بعد وہ ہنس کر کہنے لگے، "سیٹھ صاحب نے سرونٹ کوارٹرز سیدھی طرف کے حصے میں بنوا دیئے کیوں کہ وہ مشرقی حصہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سورج کی پہلی کرن پڑتے ہی سب نوکر اٹھ جائیں گے۔" میں اور ہاشم بھی مسکرا دیئے۔

اندر پہنچے تو آصف علی نیچے آتا ہوا دکھائی دیا۔ خدا جانے وہ اوپر کیا کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے ذہن میں ایک سوال آیا اور میں نے اس سے پوچھا، "آصف صاحب! کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کیا کام کرتے ہیں؟" وہ ایک لمحے کو گڑبڑا گیا اور کہنے لگا، "میں جیولر ہوں، یعنی سنار۔ حطیم جیولرز میری دکان کا نام ہے۔ اس سلسلے میں بھی میری بھائی صاحب سے ڈیلنگ ہوتی رہتی تھی۔"

میں نے سر ہلایا، جلدی سے "اللہ حافظ" کہا اور باہر نکل کر رکشا لیا اور سیدھا اپنے گھر پہنچ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

گھر پہنچ کر میں کافی دیر تک بستر پر لیٹا سوچتا رہا۔ میں نے جیب سے ناخن نکال کر دیکھا۔ بہت چمکیلا، لمبا سا ناخن تھا مگر بھاری تھا۔ میں نے اسے کھرچ کر دیکھا، اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے اُسے الٹ کر دیکھا۔ اندر کی طرف کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، انگریزی میں لکھا تھا "شمیم جیولرز" اور دکان کا علامتی نشان بھی بنا ہوا تھا۔ میں اور حیران ہوا۔ یہ شمیم جیولرز کہاں سے بیچ میں ٹپک پڑا۔ شاید یہ ناخن وہیں سے بنوائے گئے ہوں۔ میں ناخن جیب میں ڈال کر اٹھا اور سویرا کے کمرے کی طرف گیا۔ امی وہاں سویرا کے ساتھ بیٹھی کپڑے پر کڑھائی اسے سکھا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ بولیں، "ابھی کھانا لگنے میں دیر ہے۔ بیٹا! تھوڑا انتظار کرو۔" "مجھے معلوم ہے امی! میں تو آپ سے صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ آپ کو شمیم جیولرز کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"شمیم جیولرز!" امی حیرت سے بولیں۔ "شمیم جیولرز سونے کے زیورات کی دنیا میں بہت مشہور نام ہے۔ صرف اس ملک ہی میں نہیں، دوسرے ممالک میں بھی یہ بہت مشہور ہے۔ وہ اکثر و بیشتر اپنے زیورات میں جواہرات بھی استعمال کرتے ہیں۔ مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے جواب میں سیٹھ حشمت کا ذکر کر دیا۔ امی مسکراتے ہوئے بولیں، "چلو، اب تم گھر بیٹھے بیٹھے بور نہیں ہو گے۔" میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ شام کو جب ابو گھر آئے تو میں اُن کے پاس گیا۔ اُس وقت وہ اپنے کمرے میں تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا، "ابو! کیا آپ مجھے حطیم جیولرز کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟"

ابو نے مسکرا کر کہا، "کیا سیٹھ حشمت کے سالے پر شک ہو گیا ہے؟" میں حیران ہوا مگر ابو نے بتایا کہ اختر صاحب کا فون آیا تھا اور انہوں نے ساری بات بتائی تھی۔ پھر وہ بولے، "حطیم جیولرز سونے اور ہیرے کے زیورات بنانے کے سلسلے میں بہت مشہور ہیں۔ یہاں اُن کی ٹکر کی صرف ایک اور کمپنی ہے، شمیم جیولرز۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ اُن کے مالکوں کے نام ایک جیسے ہیں، آصف علی!"

مجھے جیسے کرنٹ سا لگا۔ دونوں آصف علی! تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے اٹھ آیا۔ آخری بات جو ابو نے مجھے کہی، وہ یہ تھی کہ "دیکھو بیٹے! تم یہ معاملہ حل کرنے کے لئے کوشاں ہو مگر یہ مت بھولو کہ یہ قتل کسی خاص دشمنی کی بنا پر کیا گیا ہے اور بڑے لوگوں

کے دشمن بھی بڑے ہی ہوتے ہیں، احتیاط کرو۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کھانے کے بعد میں نے ہاشم کو فون کیا۔ وہ بہت پر جوش تھا۔ "کامران! تمہارے جانے کے بعد ہم سیٹھ حشمت کے ذاتی کمرے میں گئے تھے۔ وہاں سے ایک ڈائری ملی جو سیٹھ صاحب کی اپنی ذاتی تھی۔ اُس میں انہوں نے اپنی ایک ڈیل کا ذکر کیا ہے، جس میں اُن کے ایک گاہک نے انہیں پیسے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ بہت جلد اُس کا فراڈ پولیس کے سامنے بیان کریں گے۔ انسپکٹر رضی کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے اسی نے قتل کیا ہو۔"

وہ سانس لینے کے لئے رکا تو میں نے جلدی سے سوال کیا، "کیا انہوں نے کوئی نام لکھا ہے؟"۔۔۔ "نام تو نہیں لکھا۔"

"اس کے علاوہ تو کچھ اور نہیں ملا؟"

"نہیں، میں نے رضی کو لائبریری کی تلاشی لینے کے لئے کہا تو وہ کہنے لگے کہ اس کی ضرورت نہیں۔ مگر انہوں نے کچھ بتایا نہیں کہ اُن کے دماغ میں کیا ہے۔"۔۔۔ "تم نے آصف علی کی کہانی اُن کو سنا دی تھی؟"۔۔۔ "ہاں وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ پھر انہوں نے دوبارہ نوکروں سے سوالات کئے مگر کوئی خاطر خواہ بات معلوم نہ ہوئی۔"

"اس طرح تو کچھ نہیں ہو گا۔ اچھا، یہ بتاؤ کہ نورین سے کیا کیا سوالات ہوئے تھے؟"

"ہاں، نورین نے بڑی دل چسپ باتیں بتائی تھیں۔ جب اُس کے سوتیلے ماموں آئے تھے، اُس دن رات کے وقت لائبریری سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آرہی تھیں، مگر اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کیا ہے؟ اور ہاں، ہم شریف بیگم کے کمرے میں بھی گئے تھے اور وہاں سنگھار میز پر سامنے ہی دس کے دس سونے کے ناخن سجے ہوئے تھے۔"

میں نے چونک کر پوچھا، "پورے دس! تم نے انہیں صحیح سے دیکھا تھا؟"

"ہاں میں نے دیکھا تھا۔ سب کے سب چمکیلے اور سنہرے تھے۔"

"شریفہ بیگم کیا کہتی ہے؟"

"وہی بیان کہ رات کو اُن کی آنکھ لڑائی کی آواز سن کر کھلی۔ وہ باہر آئیں تو دیکھا کہ کسی نقاب پوش نے سیٹھ کو دھکا دیا اور وہ نیچے گر پڑے۔ وہ تیزی سے نیچے آئیں تو نقاب پوش اُن کے سر میں گولی

ہمارا فرض

جاسوسی کہانیاں جرم کی مذمت کے نقطہ نظر سے پیش کی جاتی ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ مجرموں اور مجرمانہ ذہنوں کی حوصلہ شکنی ہو۔ اسلام نے اس سلسلے میں واضح طور پر بتایا ہے کہ ہر بچہ فطرتِ سلیم پر پیدا ہوتا ہے اور اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔

بچو! آؤ مل کر ہر سو نیکی کے چراغ روشن کریں اور اچھائی کے پھول کھلائیں۔ یہ دُنیا بہت حسین ہے، اس کا حسن بچانا ہمارا فرض ہے۔

مار کر فرار ہو رہا تھا۔ انہوں نے چلانا شروع کر دیا۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئیں۔"

میں نے کہا، "اچھا ہاشم! اب میں فون رکھتا ہوں۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔ اللہ حافظ۔"

دوسرے دن میں شہر کے ایک مشہور و معروف بازار میں "شمیم جیولرز" کی دکان پر کھڑا تھا۔ پہلے میں نے اُن کے زیورات اور زیورات کے معیار، اُن کے نقش و نگار کی تعریف کی۔ پھر جب منتظم بہت زیادہ خوش ہو گیا تو میں اپنے مطلب پر آ گیا۔ "سنا ہے کہ آپ لوگ سونے کے ناخن بھی بناتے ہیں۔ یہ تو کافی مشکل کام ہوتا ہو گا۔"

منتظم نے جلدی سے کہا، "نہیں، ہم عام طور پر سونے کے ناخن نہیں بناتے مگر صرف ایک دفعہ اپنے مالک کی خواہش پر بنائے تھے۔ اُن کی بہن کی بہت چاہ تھی کہ وہ سونے کے ناخن پہنیں۔ اُن کی ضد کے آگے مالک مجبور ہو گئے اور ہم نے ناخن بنا دیے۔"

میں نے پوچھا، "کیا آپ نے ابھی حال ہی میں کوئی اور ناخن بھی بنائے ہیں؟"

نہیں! اکثر ہمیں صرف زیورات کے ہی آرڈر ملتے ہیں۔"

"اچھا جی، یہ بتایئے گا کہ آپ کے زیورات میں جو ہیرے جڑے ہوتے ہیں، اُن کی ڈیلنگ آپ کس سے کرتے ہیں؟"

یہ ڈیلنگ مالک خود کرتے ہیں۔ میرا مطلب تھے، اپنے بہنوئی سیٹھ حشمت ماجد سے۔ اب تو اُن کا انتقال ہو گیا ہے آپ نے بھی اخبار میں پڑھا ہو گا، اُن کا قتل ہو گیا ہے۔"

منتظم کے جواب پر میں نے جلدی سے کہا، "اوہ، اچھا اچھا! تو سیٹھ

صاحب اُن کے بہنوئی تھے۔ تو آپ کو ہیرے کم قیمت پر مل جاتے ہوں گے؟"

اُس نے مسکرا کر جواب دیا، "سیٹھ صاحب کبھی بھی کسی کو کوئی چیز اصل قیمت سے کم نہیں دیتے تھے۔ ہمیں بھی پوری رقم دینی پڑتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس آخری ڈیلنگ پر مالک کو کچھ پریشانی بھی ہو گئی تھی۔"

"کیسی پریشانی؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہنے لگا، "ہماری کمپنی آج کل ذرا کم آمدن میں جا رہی تھی، اس لئے ہم نے مقدار سے زیادہ جواہرات خریدے۔ مالک کا خیال تھا کہ جب زیورات بن کر بکنے لگیں گے تو وہ پورے پیسے ادا کریں گے مگر سیٹھ صاحب نے جلد بازی کی اور رقم کا مطالبہ کرتے رہے۔ اُن سے انتظار بھی نہیں کیا گیا۔ مالک اس وجہ سے بھی پریشان تھے۔ سیٹھ صاحب بہت سے سناروں کے ساتھ ایسا کر چکے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ دیوالیہ ہو گئے ہیں۔" میں نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے میں وہاں سے اٹھ آیا۔ اب میرا رخ "عظیم جیولرز" کی طرف تھا۔

وہاں میں نے اپنا تعارف اخباری رپورٹر کی حیثیت سے کروایا اور کہا کہ میں سیٹھ حشمت کے قتل کے بارے میں کچھ سوالات کرنا چاہوں گا۔ یہ سنتے ہی وہاں کا منتظم بھڑک اٹھا۔ ترش روئی سے بولا، "دیکھئے صاحب! سیٹھ حشمت سے ہمارا تعلق صرف اتنا تھا کہ ہمارے مالک اُن سے جواہرات کی ڈیلنگ کرتے تھے اور ان ڈیلز کے بارے میں بھی میں کچھ نہیں بتا سکتا کیوں کہ وہ سب کچھ مالک خود ہی کرتے تھے۔ ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا جاتا تھا اور نہ مالک سے ہی ہمارا کوئی رابطہ ہے۔ وہ خود ہی کبھی کبھی چکر لگا لیتے ہیں اور ضروری ہدایات دے دیتے ہیں۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم اور نہ ہم اب کچھ اور بتائیں گے ہی۔ سمجھے آپ؟ چلئے جایئے یہاں سے۔ ہمیں اور بھی کام ہیں۔"

میں اتنی لمبی تقریر سن کر باہر آ گیا۔ حالاں کہ اُس نے اپنی دانست میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا مگر مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔

دوسرے دن میں انسپکٹر رضی سے ملنے گیا۔ وہ اور انسپکٹر فیضان مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ رسمی باتوں کے بعد میں نے پوچھا، "ہاشم نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کو مقتول کی ذاتی ڈائری ملی ہے۔ کیا آپ مجھے وہ دکھا سکتے ہیں؟" جواب میں انسپکٹر رضی نے انسپکٹر فیضان کو اشارہ کیا اور وہ الماری میں سے ایک لال رنگ کی ڈائری نکال لائے۔ میں نے کھول کر شروع کے صفحات پر نظر ڈالی۔ اس میں زیادہ تر سیٹھ حشمت کی سناروں سے ڈیل کا ذکر تھا اور یہ بھی ذکر تھا کہ وہ اُن کو وقت پر پیسے نہ دے سکے اور مہلت مانگی، مگر سیٹھ صاحب نے پولیس کی مدد سے پیسے نکلوائے۔ تحریر کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ سیٹھ صاحب ایک مغرور تاجر تھے جنھیں کسی پر رحم کرنا نہیں آتا تھا۔ نہ ان کو یہ پرواہ تھی کہ اُن سے متاثرہ سناروں کی ساکھ خراب ہو گئی تھی اور اب وہ دو وقت کی روٹی کو ترس رہے تھے۔ بلکہ سب کچھ بڑے فخر سے لکھ رکھا تھا۔ جیسے یہی اُن کی کامیابی کا سنگِ میل تھا؟

آخری اندراج میں بھی ایک ایسے ہی سنار کا ذکر تھا، جس کے بارے میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ اُسے پولیس کے حوالے کریں گے۔ اُس نے صرف ایک مہینے کی مہلت مانگی تھی مگر سیٹھ صاحب نے بڑے کروفر سے انکار کر دیا تھا۔ آخر میں لکھا تھا "A. S. J"۔ میں نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ میرا اندازہ بالکل صحیح تھا۔

☆جاری ہے☆

ہندوستان سخت تاریکی میں ۔۔۔

شاہ جہاں نے اپنی بیوی ممتاز کی یاد میں تاج محل بنوایا اور کھربوں روپے خرچ کئے۔ مغل بادشاہ عمر بھر کھانے پینے، علاقے فتح کرنے اور موج مستی کرنے میں مگن رہتے تھے۔ یہی تاج محل اگر نہ بنتا تو دنیا کا کچھ نہ بگڑتا بلکہ اگر وہ یہی روپے غربا کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا تو دنیا کا کچھ بنتا۔ مغل بادشاہ درس گاہوں اور علم و ہنر پر بھی مناسب توجہ نہیں دیتے تھے۔ مغل بادشاہوں کی تاریخ اس لحاظ سے تاریک نظر آتی ہے۔ وہ عمر بھر آپس میں بھی لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، تخت کی خاطر بھائی بھائی کا خون بہاتا تھا۔ لہٰذا ہندوستان اُس وقت دوسری دنیا کی نسبت سخت تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

ایک عقلمندی جو کام آ گئی

محمد جواد (فیصل آباد)

منگورا شہر کے ایک اچھے ہوٹل کے سامنے ایک لگژری جیپ آکر رکی۔ اس میں سے چار افراد مشتاق، افضل، آصف اور سہیل باہر نکلے۔ ڈرائیونگ مشتاق کر رہا تھا۔ وہ بائی سائیکل سے لے کر جہاز تک اڑانا جانتا تھا۔

اس ہوٹل میں غیر ملکی بھی آکر رہا کرتے تھے مگر ان دنوں حالات خراب ہونے کی وجہ سے غیر ملکی آنا بند ہو گئے تھے۔ مگر اب امن معاہدہ ہونے کے بعد کچھ غیر ملکی آرہے تھے۔

یہ جان کر انہیں خوشی ہوئی کہ یہاں تین غیر ملکی افراد کا ایک گروپ قیام پذیر تھا۔ انہوں نے مشتاق کے نام سے ایک کمرا بک کروایا اور لاؤنج میں آکر اُن کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

صبح کے وقت غیر ملکیوں کا گروپ باہر نکلا جس میں دو لڑکیاں اور ایک مرد شامل تھا۔ انہوں نے گروپ کا تعاقب کیا اور تھوڑی دیر بعد اُن کو جا لیا۔ اُن لوگوں کو گن پوائنٹ پہ اغوا کر لیا مگر یہ کیا۔ ایک گاڑی جسے ایک لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی اور برابر میں ایک کم عمر لڑکا تھا، انہوں نے یہ سب کارروائی دیکھ لی تھی۔

وہ لوگ کوئی ثبوت چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ سہیل فوراً گاڑی سے اترا اور اس گاڑی میں موجود ان دونوں کو بھی گن پوائنٹ پر اغوا کر لیا۔ سہیل ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور لڑکی کو لینڈ کروزر کا تعاقب کرنے کو کہا۔

دونوں گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے آبادی سے دور نکلنے لگیں۔ یہ دونوں لڑکی اور لڑکا احمد حسن اور عظمیٰ تھے۔ قرآن حافظ احمد حسن سوات کے علاقہ چار باغ میں رہتا تھا۔ وہ ایک سولہ سالہ ذہین لڑکا اور مارشل آرٹ کا سٹوڈنٹ تھا۔ چار باغ میں باغات بہت تھے اور یہ حسین علاقہ تھا۔ احمد حسن کے تایا کی بیٹی لاہور سے زندگی میں پہلی بار ایم اے کا امتحان دے کر سوات کا حسن دیکھنے آئی تھی۔ سارا گھرانا ابھی سویا پڑا تھا کہ بے تاب عظمیٰ سوات کے نظارے کرنے کے لئے اپنے چچا کے بیٹے کو ساتھ لے کر باہر نکل آئی۔۔۔ مگر تقدیر نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ وہ سیر کرنے نکلے تھے اور ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئے۔

مشتاق نے گاڑی ایک آبادی سے دور نظر نہ آنے والے ایک کچے سے کھنڈر احاطے میں روک لی۔ سہیل اور آصف نے گن پوائنٹ پر مغویوں کو احاطے میں لے کر جانا شروع کر دیا۔ جب کہ مشتاق گاڑی میں رہا اور افضل اس کھنڈر کی چھت پر جا کر بیٹھ گیا۔ مغویوں کو ایک کمرے میں بند کرنے کے بعد سہیل باہر پہرا دینے

لگا، باقی لوگوں نے گاڑیوں سے سامان نکالنا شروع کر دیا جو کہ ریموٹ کنٹرول بموں، نائٹ ویژن گلاسز اور جدید اسلحہ پر مشتمل تھا اور کھانے کی چیزیں بھی اس سامان میں شامل تھیں۔

یہ ایک متروک جگہ تھی اور لوگوں کی آمد ورفت ادھر نہ ہونے کے برابر تھی۔ اغوا کاروں کا مقصد غیر ملکی کو پاکستان نہ آنے دینا اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کو بدنام کرنا تھا۔

اور دنیا کو یہ باور کرانا تھا کہ پاکستان غیر ملکی لوگوں کے لئے ایک غیر محفوظ ملک ہے۔

یہ لوگ دراصل قبائلی نہیں تھے بلکہ انہوں نے قبائلی بننے کے لئے میک اپ کر رکھا تھا۔ یہ سب غیر ملکی طاقتوں کے ایجنٹ تھے۔ ان سب کے اصل نام کچھ اور ہی تھے۔

جب سے 9/11 کا واقعہ رونما ہوا ہے۔ افغانستان کے راستے یہ غیر ملکی لوگ پاکستان میں داخل ہو رہے ہیں۔

یہ جاسوس بھی قندھار سے ہوتے ہوئے مختلف شمالی علاقوں میں داخل ہوئے اور پشاور میں ایک دوسرے سے ملے۔ سوات میں گاڑیوں کے رجسٹریشن نمبر نہیں ہوتے، اس لیے انہیں زیادہ روپوں کی بدولت ایک جیپ بھی مل گئی۔

شام تک انہوں نے مغویوں کو بند رکھا۔ رات کو انہیں کھانا دیا گیا، جس کا سب ہی لوگوں نے بائی کاٹ کر دیا مگر پھر مجبوراً کھا لیا کیوں کہ انہیں زندہ بھی تو رہنا تھا۔ کھانے کے کچھ دیر بعد انہوں نے مغویوں کو قہوہ پیش کیا۔ سردی کی وجہ سے باقی چاروں نے تو اسے پی لیا مگر احمد نے قہوہ چھپا دیا اور سب کی آنکھ بچا کر اسے نیچے گرا دیا۔ اسے شک تھا کہ اس میں کچھ ملایا نہ ہو اور وہی ہوا جس کا اسے شک تھا۔ دھیرے دھیرے سب سونے لگے۔ کچھ دیر بعد اچانک دروازہ کھلا تو احمد نے سونے کی ایکٹنگ کی۔ اس نے دیکھا کہ سہیل اندر داخل ہوا اور سب کو سوتا دیکھ کر واپس چلا گیا مگر جاتے ہوئے اس نے دروازہ مقفل نہیں کیا۔ احمد قریباً ایک گھنٹا یوں ہی لیٹا رہا۔ پھر اس نے حرکت کرنا شروع کی۔ وہ دھیرے دھیرے دروازے کے قریب آیا۔ اس کے بعد اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کو کوئی نظر نہ آیا۔ تب اس نے ہمت کر کے باہر قدم رکھا تو اسے کچھ سامان نظر آیا۔ یہ کچھ کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔

ادھر مشتاق اور اس کے ساتھی میڈیا اور اعلیٰ حکومتی عہدے داروں سے رابطے میں آنے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کے خیال میں سب لوگ نشے کی حالت میں سوئے ہوئے تھے۔

اس کھنڈر احاطے سے باہر نکل کر وہ بھاگنے لگا۔ اتنی دیر میں مشتاق نے موبائل فون کے ذریعے میڈیا کو یہ خبر دی کہ ہم نے تین غیر ملکی اور دو پاکستان افراد کو یرغمال بنا لیا ہے۔ میڈیا میں یہ بات جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ حکومت نے اعلیٰ عہدے داروں کی میٹنگ بھی بلائی گئی۔

دہشت گردوں نے کوئی بھی مطالبات نہیں کیے تھے۔ وہ دراصل اس خبر کو سب سے پہلے بین الاقوامی سطح پر اچھال کے غیر ملکیوں کو مارنا چاہتے تھے تاکہ پاکستان بدنام ہو۔

احمد باہر نکل آیا تھا، ہر سو گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اتنے میں اسے سامنے سے ایک گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے اسے ہاتھ دیا تو گاڑی رک گئی۔ یہ ایک ٹرک تھا جو پیاز لے کر راولپنڈی کی طرف جا رہا تھا۔ احمد نے اس سے لفٹ طلب کی، ڈرائیور راضی ہو گیا۔ احمد نے سارا قصہ ڈرائیور گل خان کو بتایا۔ ڈرائیور نے راستے میں آنے والی پولیس چوکی پر گاڑی روک لی۔

احمد نے تمام معلومات وہاں پر موجود چوکی انچارج کو بتا دیں۔ اس نے وائرلیس کے ذریعے شہر میں اطلاع دے دی۔ منگورا اور اردگرد سے تمام فورس طلب کر لی گئی۔

مقامی لوگوں نے بھی بھرپور مدد کرنے کی ٹھان لی۔ وہ بھی اپنے اپنے گھر سے ہتھیار لے کر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔

پولیس نے ان کھنڈرات کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا اور میگا فون پر دہشت گردوں کو خود کو پولیس کے حوالے کرنے کو کہا مگر انہوں نے انکار کر دیا اور وہ لوگ مغویوں کو لے کر چھت پر آگئے اور پولیس کو محفوظ راستہ دینے کو کہا اور مزید یہ کہا کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو وہ مغویوں کو ہلاک کر دیں گے۔

یہ سن کر پولیس کو مجبوراً پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ دہشت گردوں نے ایک ہیلی کاپٹر کا مطالبہ کر دیا۔ ان کا یہ مطالبہ حکومت تک پہنچایا گیا۔

مگر حکومت نے کمانڈو آپریشن کرنے کا حکم دے دیا۔ لہذا فوج طلب کرلی گئی۔

فوج نے آکر اپنی پوزیشن سنبھال لی اور آپریشن شروع کر دیا مشتاق اور اس کے ساتھیوں نے پہلے تو مقابلہ کیا مگر پھر انہوں نے وہاں سے نکلنے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے مغویوں کو بم باندھ دیئے اور انہیں ڈھال بنا کر باہر آگئے۔ فوج کو مجبوراً فائرنگ روکنی پڑی۔

یہ لوگ مغویوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک گاڑی میں مغویوں سمیت وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

ان کی منزل اب پاکستان اور افغانستان کا باڈر تھا۔ وہ جلد از جلد پاکستان چھوڑنا چاہتے تھے مزید یہ کہ وہ مغویوں کو پاکستان کے اندر ہی مارنا چاہتے تھے تاکہ ایک ایشو بن سکے۔

سرحد کے قریب آکر انہوں نے تمام مغویوں کو ایک گھاٹی میں پھینک دیا اور اتنی دور چلے گئے کہ انہیں کوئی نقصان نہ ہو مگر یہ کیا۔۔۔ جب انہوں نے بم چلانا چاہا تو وہ چلا نہیں۔ وہ تھوڑا قریب آئے۔ ان کا خیال تھا کہ ریموٹ کی رینج کم ہو گئی ہے مگر پھر بھی وہ کامیاب نہیں ہو پائے۔ انہوں نے ریموٹ کھول کر دیکھا، اس میں سیل نہیں تھے۔ دراصل احمد حسن نے وہاں نکلتے وقت بموں کے ریموٹ کنٹرولرز کے سیل نکال لئے تھے۔

اتنی دیر میں پاکستانی فورسز ان کے سر پر پہنچ گئی تھیں۔ انہوں نے باڈر کی طرف گاڑی دوڑادی مگر سیکورٹی فورسز نے گاڑی تباہ کر دی اور تمام مغویوں کو بازیاب کروالیا۔ ان میں سے کچھ لوگ زخمی تھے، ان کو طبی امداد پہنچائی گئی۔ یوں احمد حسن کی حاضر دماغی سے پانچ معصوم لوگوں کی جان بچ گئی۔ اور ملک کا نام بھی بدنام ہونے سے بچ گیا۔ اس کے اس بہادری کے کارنامے پر والئی سوات، حکومت سرحد، حکومت پاکستان نے اسے انعامات دیئے۔☆

ایک تھا آدمی، اس کے تین بیٹے تھے۔ وہ بوڑھا ہو گیا، بیمار ہوا اور انتقال کر گیا۔ تینوں بھائیوں نے باپ کی جائے داد تقسیم کرلی۔ دونوں بڑے بھائیوں نے عیش پرستی میں اپنی جائے داد جلدی جلدی تباہ کر دی۔ چھوٹے بھائی نے اپنی جائے داد میں اضافہ کیا۔ اس نے پیسا جمع کر کر کے دو تین بھینسیں بھی خرید لیں، ان کو جنگل میں چرا لاتا، دودھ دوہ لیتا اور بیچ آتا، اس طرح اس کی دولت میں اضافہ ہوتا گیا۔ والدین پیار سے اسے گھنگھرو کہتے تھے۔

گھنگھرو کی بڑھتی ہوئی دولت سے اس کے بھائی حسد کرنے لگے کہ ہم شادی شدہ اور بال بچوں والے ہیں، ہمارے اخراجات زیادہ ہیں۔ اس کے پاس مال و دولت ہے اور خرچ کچھ بھی نہیں۔ اس سے سب کچھ ہتھیا لینا چاہئے۔ اس کے لئے انہوں نے تراکیب بنانی شروع کر دیں۔ انہوں نے طے کیا کہ جب یہ دریا پر بھینسوں کو پانی پلانے جائے تو اسے وہاں درخت سے باندھ کر اس کی بھینسوں کو ہانک کر لے آئیں گے، ان پر قبضہ کرلیں گے۔

پھر رات کو جا کر اسے درخت سے کھول کر دریا میں پھینک دیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے دونوں بھائی اس کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ جب بھینسیں پانی پی رہی تھیں، بھائی اس سے کہنے لگے، بھلا درخت پر چڑھ کر دکھاؤ تو۔ اس نے فٹافٹ درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی تنے کے نچلے حصے پر ہی تھا کہ بھائیوں نے اسے رسے کے ساتھ کس کے باندھا بھینسوں کو لیا اور چلتے بنے۔

گھنگھرو کو بندھے ہوئے گھنٹا بھر ہی ہوا تھا کہ ایک مسافر کا ادھر سے گزر ہوا اس نے پوچھا، تمہیں یہاں کس نے اور کس لئے باندھ رکھا ہے؟ کہنے لگا، میرے بڑے بھائیوں نے باندھا ہے کیوں کہ وہ میری شادی کرنا چاہتے تھے اور میں نے انکار کر دیا۔ یہ

مجھے ان کی حکم عدولی کی سزا مل رہی ہے۔ مسافر نے پوچھا، تم شادی کیوں نہیں کرواتے۔ کہنے لگا، دیکھو بھائی انسان اپنے ہم پلہ گھر میں شادی کرواتے۔ وہ بہت دولت مند لوگوں کی اکلوتی بیٹی ہے جب کہ میں غریب آدمی ہوں، کل کلاں نہ بنی تو کیا فائدہ۔

مسافر کہنے لگا، تم اس سے میری شادی کرادو۔

کہنے لگا، اچھا تم مجھے کھول دو۔ میں تمہیں یہاں باندھ دیتا ہوں، رات کو میرے بھائی آئیں گے، تمہاری شادی کر دیں گے، میں کہیں بھاگ جاؤں گا تاکہ شادی سے بچ جاؤں۔

مسافر نے ٹھنگرو کو درخت سے کھول کر نیچے اتار دیا۔ اس نے مسافر کو وہیں پر درخت سے باندھ دیا۔ رات کو اس کے بھائی آئے۔ مسافر کو درخت سے کھولا۔ دریا میں پھینکا اور اپنی دانست میں ٹھنگرو سے نجات حاصل کر کے گھر چلے گئے۔ بھائیوں کی غیر موجودگی میں ٹھنگرو ان کے گھروں سے تمام بھینسیں اپنے گھر لے آیا۔ وہ حیران ہوگئے کہ بھینسیں کون لے گیا۔ صبح جب ٹھنگرو کو بھینسیں لے کر چرانے کے لئے جنگل کی طرف جاتے دیکھا تو حیرت سے ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کہ اس کو رات دریا میں پھینکا تھا، یہ زندہ سلامت بچ کر گھر آگیا ہے۔ شام کو وہ کوئی اور ٹھکانا تلاش کر کے بھینسیں وہاں چھوڑ آیا۔ گھر سے اپنا مختصر سا سامان نکال کر لے گیا اور اس گھر کو خیر باد کہہ دیا کیوں کہ اسے بھائیوں کا اعتبار نہیں رہا تھا۔

اس کے بھائی اس کے گھر کو آگ لگا کر اپنے گھر جا کر سو گئے۔ سارا گھر جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ ادھر ٹھنگرو صبح سویرے اٹھا۔ بھینسوں کو جنگل میں چرایا، دودھ دوہا اور بیچنے کے لئے شہر لے گیا۔ بھائی مزدوری کی تلاش میں بازار میں کھڑے تھے، اسے دودھ کی بالٹیاں اٹھائے جاتے دیکھا تو حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ آج رات اس کے گھر کو آگ لگا دی تھی، یہ زندہ کیسے بچ گیا۔

وہ دودھ بیچ کر فارغ ہو کر اپنے پرانے گھر گیا۔ کیا دیکھتا ہے، وہاں راکھ کا ڈھیر ہے۔ اس نے ایک چھکڑا لیا۔ اس پر راکھ لادی اور کھیتوں کی طرف لے گیا تاکہ کھیتوں میں فصل پر ڈالنے کے کام آسکے۔ ایک کسان کے پالک کے کھیت میں کیڑے لگے ہوئے تھے، اسے کوئی علاج نہیں سوجھتا تھا۔ جب اس کھیت کے کنارے سے راکھ کا چھکڑا گزرا، راکھ پالک کے پتوں پر گری تو اس سے کیڑے نیچے گر کر پتے صاف ہو گئے۔ کسان نے دیکھا تو اسے فصل کا علاج راکھ میں نظر آیا۔ بہت خوش ہوا کہ چلو میرا مسئلہ تو حل ہوا۔ اس سے پوچھا، کیوں میاں! یہ بیچو گے؟

کہنے لگا، ہاں بیچوں گا۔۔۔ پوچھا، کیا لو گے؟

کہنے لگا، یہی چھکڑا گندم کا بھر کر لوں گا۔۔۔ کسان نے منظور کر لیا۔ ساری راکھ خرید کر کھیتوں پر بکھیر دی اور چھکڑے میں گندم بھر دی۔ وہ گندم کا چھکڑا لے کر جنگل کی طرف چلا گیا۔ اس طرح اسے سال بھر کا راشن مل گیا۔ اسے اس سودا بازی میں دیر لگ گئی۔ اس کی بھینسیں جنگل میں دیر تک آوارہ گردی کرتی رہیں۔ ایک آدمی

نے سوچا کہ یوں ہی پھرتی پھراتی بھینسیں ہیں، ان کو ہانک کر شہر کی طرف روانہ ہوا۔ ٹھنٹھرو کے بھائی اس کی تلاش میں پھر رہے تھے، رات کی تاریکی میں انہوں نے دیکھا کہ وہ بھینسیں لئے جا رہا ہے، اس کو پکڑ کر خوب مارا پھر اس کا گلا گھونٹ دیا اور بھینسیں لے گئے۔

ٹھنٹھرو رات کو اپنے نئے گھر گندم چھوڑ کر بھینسوں کی تلاش میں نکلا تو وہ اس کے بھائیوں کے گھر میں تھیں، انہیں لیا اور جنگل کی طرف چلا گیا۔ بھائیوں نے پھر دیکھ لیا۔ حیران تھے کہ گلا گھونٹ کر مار دیا، پھر بھی زندہ ہے۔ فرض کیا کہ مرا نہ بھی ہو، تب بھی اس کی اتنی ٹھکائی ہوئی تھی کہ چل پھر نہیں سکتا تھا، کتنا سخت جان ہے۔

ٹھنٹھرو کو جنگل جاتے ہوئے راستے میں کیچڑ سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس نے سوچا، صبح یہاں ریت ڈال دوں گا تاکہ راستہ صاف ہو جائے۔ اس نے تھوڑی دیر آرام کیا، آدھی رات کو اٹھ کر ریت لینے دریا پر چلا گیا۔ دریا کا پانی درمیان میں بہہ رہا تھا، دونوں طرف ریت ہی ریت پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے جمع کر کے چھکڑے میں بھرنی شروع کر دی، جب بھر چکا تو چھکڑا لے کر کیچڑ والی جگہ کی طرف چلا گیا تاکہ دن ہونے پر روشنی میں مناسب جگہ ڈال سکے۔

اس کے بھائی پھر اس کو تلاش کرتے پھر رہے تھے لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ البتہ اس کے چھکڑے کے بیلوں کی گھنٹیاں دریا کی طرف سے ٹن ٹن بجتی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ادھر آ گئے۔ ایک جادوگر رات کو دریا کے بیچ میں کھڑا ہو کر جادو کر رہا تھا۔

وہ کہنے لگے، اب دیکھو دریا کے بیچ میں کھڑا جانے کیا کر رہا ہے، انہوں نے اس کا گلا کاٹ کر دریا میں پھینک دیا اور چلے گئے۔

ٹھنٹھرو صبح صبح اٹھ کر ادھر گیا۔ چھکڑا لیا اور کیچڑ کے علاقے کی طرف ریت ڈالنے کے لئے چلا گیا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اسے ایک امیر عورت ملی جو شہر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی بچی تھی، وہ عورت بچی کو اٹھائے اٹھائے تھک گئی تھی۔ اس سے کہنے لگی، بھائی اس کو چھکڑے پر بیٹھا لو۔

وہ کہنے لگا، نہیں، میں نے چھکڑے پر ریت کے نیچے اپنی دولت رکھی ہوئی ہے، اگر تمہاری لڑکی نے اس پر بیٹھ رونا شروع کر دیا تو ساری دولت ریت کا ڈھیر بن جائے گی۔ وہ کہنے لگی، اگر تمہاری دولت ریت کا ڈھیر بن گئی تو میں تمہیں چھکڑا بھر کر دولت دے دوں گی۔ اس شرط پر اس نے بچی کو چھکڑے پر بٹھا لیا۔ جوں جوں ریت پر بوجھ پڑتا، وہ نیچے کو سرکتی، بچی پھسلتی اور نیچے گرنے کے خیال سے ڈرتی۔ آخر اس نے رونا شروع کر دیا۔

وہ عورت سے کہنے لگا، دیکھو ساری دولت ریت کا ڈھیر بن گئی ہے۔ دن خاصا ہو چکا تھا، کیچڑ والا علاقہ آ گیا۔ اس نے بظاہر عورت کو دکھانے کے لئے ساری ریت کیچڑ میں پھینک دی اور اسے دکھا دیا کہ دولت ریت کا ڈھیر بن گئی ہے۔

وہ عورت ایک سیٹھ کی احمق بیوی تھی جو دن رات کنجوسی کر کے دولت کے انبار لگا رہا تھا۔ وہ خالی چھکڑے پر عورت اور بچی کو اس کے گھر چھوڑنے چلا گیا۔ اس کا خاوند رات بھر کا سفر طے کر کے گہری نیند سو رہا تھا۔ اس عورت نے سونا دولت لا کر اس کا چھکڑا بھر دیا۔ وہ بھرا ہوا چھکڑا لے کر جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں ٹھنٹھرو کو اس کے بھائی مل گئے۔ انہوں نے سوچا کہ رات اس کی گردن کاٹ کر دریا میں پھینک دیا تھا۔ اب پھر یہ سونے سے لدا چھکڑا لے کر چلا جا رہا ہے۔ اس سے کہا، رات تمہیں دریا میں پھینکا تھا، تم یہ دولت کہاں سے لے آئے؟

وہ کہنے لگا، ہاں جب مجھے مار کر دریا میں پھینکا گیا تو میں اس کی تہ میں چلا گیا، وہاں بے حد دولت تھی۔ میں نے تھوڑی سی نکالی تو چھکڑا بھر گیا۔ اسے گھر چھوڑ کر پھر لینے جاؤں گا۔ وہاں بہت لوگ دولت نکال رہے تھے۔ ایسا نہ ہو ساری لے جائیں۔

یہ سنتے ہی دونوں بھائیوں کو لالچ آ گیا، وہ اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر دولت نکالنے کے لئے چلے گئے تاکہ سب مل کر بہت سی دولت لے آئیں۔ انہوں نے دریا پر پہنچ کر پہلے اپنے بیوی بچوں کو دریا کے منجدھار میں پھینکا کہ دولت نکال نکال کر پکڑانا، ہم اکٹھی کرتے جائیں گے۔ جب تین چار گھنٹے گزر گئے، کسی نے دولت نکال کر نہ پکڑائی تو کہنے لگے، پتا نہیں انہوں نے کتنی بڑی بڑی گٹھریاں باندھ لی ہوں گی، جو ان سے اٹھا کر پکڑائی نہیں جاتیں، ہم خود لے آتے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ دریا میں کود گئے۔ دونوں بیوی بچوں سمیت ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔

ٹھنٹھرو نے کسی اچھی سی شریف لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر آباد کر لیا اور پرسکون ہو کر ٹھاٹھ سے رہنے لگا۔☆

دو دوست بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ گفت گو کا رخ شیطان کی طرف مڑ گیا۔ "کتنا اچھا تھا اگر شیطان نہ ہوتا؟" ایک نے کہا۔ "ہاں واقعی!" دوسرا بولا۔ "اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی برائی ہوتی اور نہ کسی سزا کا خوف!"

"لیکن ایک بات ہے۔۔۔" پہلے نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کون سی بات۔۔۔؟" دوسرا درمیان میں بولا۔

"اگر سزا و جزا سسٹم نہ ہوتا تو شائد یہ زندگی ایک مشینی زندگی ہوتی!" اس نے دوست کی طرف دیکھا۔ "کہ نہیں؟"

"بات تو تمہاری دل کو لگتی ہے۔۔۔!" دوسرے نے سوچتے ہوئے پر خیال انداز میں کہا۔ "مگر پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا۔۔۔ انسانوں کا بیڑا غرق کرنے والا صرف اور صرف ایک ہی ہے۔۔۔ اور وہ ہے شیطان۔۔۔!"

"وہ تو ہے۔۔۔!" پہلے نے تائید کی۔

"مجھے کیوں کوس رہے ہو؟" اچانک ان کے کانوں میں آواز گونجی۔ وہ بری طرح چونکے۔ انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ وہاں قرب وجوار میں کوئی نہ تھا۔ "تم نے کچھ سنا؟" ایک بولا۔

"ہاں!" دوسرا اثبات میں سر ہلا کر بولا "کسی نے کہا ہے۔۔۔ مجھے کیوں کوس رہے ہو؟"

"ہاں بالکل! میں نے بھی یہی سنا ہے!"

"کہیں کوئی جن وغیرہ نہ ہو۔۔۔؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔۔۔!" دوسرا بھی کچھ سکڑتے ہوئے بولا۔

"کیا تم خدا کی ذات پر ایمان رکھتے ہو۔۔۔؟" آواز ابھری۔

"ہاں کیوں نہیں؟" دونوں بولے مگر ڈرے ڈرے سے۔

"پھر مجھ سے ڈر کیوں رہے ہو؟" کسی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہم ڈر نہیں رہے۔۔۔!" ایک فوراً سنبھلتے ہوئے بولا۔ "ہاں بالکل!" دوسرے نے بھی تائید کی۔

"مگر تم ہو کون؟" اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

"میں وہی ہوں، جس کے بارے میں تم لوگ بات کر رہے تھے۔" جواب ملا۔

"کیا مطلب؟؟؟" دونوں بری طرح چونکے۔ "شیطان۔۔۔!!!"

"ہاں!۔۔۔ خوب پہچانا۔۔۔!" جواب ملا مگر ایک ہلکی سی ہنسی کے ساتھ۔ "مت۔۔۔ تم کہاں ہو۔۔۔!" دونوں کچھ گھبرا سے گئے۔

اسی کے ساتھ ان کے سامنے ایک شیطان نمودار ہو گیا۔ وہ اتنا خوب صورت تھا کہ بیان سے باہر۔ انہوں نے زندگی

میں اس سے خوب صورت شے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

"شیطان۔۔۔ اور اتنا خوب صورت۔۔۔!!!" دونوں کی حیرت دیدنی تھی۔ "اصل چہرے نقل چہروں کے پیچھے اکثر چھپے رہتے ہیں۔" شیطان نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

شیطان پھر آہستہ آہستہ ٹرن ہونے لگا۔ ہوتے ہوتے سامنے والا حصہ پیچھے چلا گیا اور پیچھے والا حصہ سامنے آگیا۔ اسی کے ساتھ ہی ان کی چیخیں نکل گئیں۔ جس میں خوف و دہشت کے ساتھ ساتھ انتہا کی بدصورتی کا عجیب و غریب تکلیف دہ احساس بھی تھا۔ انہوں نے ایسی بدہیبت اور خوف ناک شے کا نہ تو کبھی نظارہ کیا تھا اور نہ کبھی سوچا ہی تھا، نہ کہیں پڑھا تھا اور نہ کبھی کسی کی زبانی سنا تھا۔ ان کی آنکھیں بے اختیار بند ہو گئیں۔ انہیں یقین آگیا۔ یہ شیطان ہی ہے۔ تب ہی تو اتنا بدصورت اور۔۔۔ اور شیطان ہنسا۔

"تم نظروں کے سامنے نہ ہی رہو تو اچھا ہے!" دونوں بے اختیار بولے۔ ابھی تک انہوں نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

"ٹھیک ہے، میں اب نظر نہیں آؤں گا۔" جواب ملا۔ "آنکھیں کھول لو!"

انہوں نے چند لمحے کے انتظار کے بعد آہستہ آہستہ آنکھیں کھول لیں۔ "تھینکس گاڈ۔۔۔!!!" دونوں بے اختیار گہری سانس لیتے ہوئے بولے کیوں کہ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ اگر تھے تو وہ دونوں۔

"میں تو کبھی بھی نہیں جاتا!" وہ ہنسا۔ "ہمیشہ انسان کے ادھر ادھر، قرب وجوار میں موجود رہتا ہوں۔"

"ارے ہاں! ہم تو بھول ہی گئے۔" دونوں اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولے "کہ تم شیطان ہو۔۔۔!"

"تم لوگ اور بھی بہت سی باتیں بھول جاتے ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بڑبڑایا۔ "اچھا یہ بتاؤ! تم ہمارے پاس آئے کیوں تھے ابھی؟" ایک نے ہمت کر کے پوچھا۔ "مطلب، کیا مقصد تھا تمہارا، ہم سے بات کرنے کا؟"

"میں تم دونوں کی ایک غلط فہمی دور کرنے آیا تھا۔" شیطان نے جواب دیا۔

"بولو! کون سی غلط فہمی تم دور کرنے آئے ہو ہماری؟"

"وہی، جو ازل سے انسان کو ہے، میرے بارے میں۔۔۔!"

شیطان بولا۔

"وہ کیا۔۔۔؟"

"غلط کام وہ خود کرتا ہے اور الزام دھرتا ہے مجھ پر۔۔۔!"

"اس میں غلط کیا ہے آخر؟۔۔۔ برائی کے ذمہ دار اور ماخذ تو تم ہی ہو نا!"

"اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھاؤ۔۔۔!" شیطان نے کہا۔

دونوں نے جھجکتے ہوئے اپنا ایک ایک ہاتھ آگے پھیلایا۔ اسی کے ساتھ ان کی ہتھیلی پر کسی نے ایک چٹکی سفید سفوف رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" دونوں نے حیرت سے پوچھا۔

"زہر۔۔۔!"

"کس لئے۔" انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"تمہارے کھانے کے لیے۔" جواب ملا۔

"کیوں ہم نے کیا کیا ہے جو زہر کھائیں!" دونوں نے ہتھیلی پر رکھا سفوف نیچے پھینک دیا۔

شیطان نے ہنس کر کہا۔ "اب خود بتاؤ۔۔۔ میں نے تمہیں زہر دیا کھانے کے لئے۔۔۔ مگر تم نے نہیں کھایا۔ کیوں کہ یہ تمہاری مرضی تھی، میری نہیں۔۔۔ مطلب تم نے میری بات چاہے وہ ٹھیک تھی یا غلط، نہیں مانی۔۔۔ مانی تو اپنی۔۔۔ مطلب تم نے خود سوچا کہ کرو تو کیا؟"

دونوں چند لمحے کے لئے خاموش ہو گئے کیوں کہ وہ کچھ لاجواب سے ہو گئے تھے۔

اس نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ! میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں!" اور وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلے پڑے۔ وہ انہیں لے کر

توجہ فرمائیں:

تعلیم و تربیت میں چھپنے والی تمام تحاریر ماسوائے سچی، اسلامی، معلوماتی و تاریخی تحاریر کے، فرضی کرداروں پر مبنی ہوتی ہیں جو بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے نیک جذبے کے تحت شائع کی جاتی ہیں۔ کوئی بھی مماثلت محض اتفاق ہو گا اور ادارہ و قلم کار ذمہ دار نہ ہو گا۔

ایک حلوائی کی دکان پر گیا۔ پھر ان سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اب ذرا غور سے دیکھنا۔ کیا ہوتا ہے؟"

حلوائی اس وقت شیرے میں رس گلے رکھ رہا تھا۔ شیطان نے اپنی ایک انگلی شیرے میں ڈبوئی اور پھر اسے دیوار پر مل دیا۔ چند لمحوں بعد ایک مکھی شیرے پر آبیٹھی۔ چند لمحے اور گزرے ہوں گے کہ کہیں سے ایک چھپکلی برآمد ہوئی اور دبے قدموں مکھی کا شکار کرنے کے لیے آگے بڑھنے لگی۔ ایسے میں حلوائی کی پالتو بلی جو ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اس نے مکھی پر حملہ کرنے کی نیت سے بڑھتی ہوئی چھپکلی پر چھلانگ لگا دی۔ بلی کو دیکھ کر ایک کتا جو دکان سے باہر بیٹھا تھا، اس نے بلی پر چڑھائی کر دی۔ پھر کتے کے مالک اور حلوائی نے ایک دوسرے کا گریبان پکڑ لیا۔ چند لمحوں میں وہاں وہ لڑائی شروع ہو گئی کہ مت پوچھیں۔ کچھ دیر بعد حلوائی کی دکان میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ کوئی کتے کو الزام دے رہا تھا، کوئی بلی کو، کوئی کسی کو اور کوئی کسی کو۔

"یہ ہے انسان کی عادت۔!" شیطان ہنسا۔ "الزام بازی۔!"

"مگر یہ سب کچھ تو تمہارا کیا دھرا ہے نا!" دونوں بولے۔ "پھر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"پھر وہی الزام۔!" شیطان بولا۔ "اب میں نے کیا کر دیا؟"

"تم ہی نے سب کچھ کیا ہے۔" ایک بولا۔

"ہاں بالکل۔" دوسرے نے تائید کی۔

۔۔۔ اگلے شماروں میں، تعلیم و تربیت میں پڑھیے گا۔۔۔!

1۔ سر پہ کھڑا ہے امتحان۔ — بشیر احمد راہی۔

2۔ یہ ہے تاج محل آگرہ۔ — ناصر زیدی۔

3۔ جنت۔ — علی اکمل تصور۔

4۔ کھائی مکھی۔ — بشیر احمد راہی۔

5۔ بیماری بڑی مہنگی۔ — حامد مشہود

"کیسے؟" شیطان نے پوچھا۔

"نہ تم شیرا دیوار پر ملتے۔۔۔ نہ یہ سب کچھ ہوتا۔۔۔!"

"بالکل درست کہہ رہے ہو!" شیطان بولا۔ "لیکن یہ تو میرا فعل ہے، تمہارا فعل کون سا ہے؟ کبھی سوچا؟ اچھا، چلو یہ بتاؤ اگر اس پورے واقعے میں سے مکھی کو نکال دیں یعنی یوں سمجھ لو کہ اس پورے واقعے میں اگر مکھی نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ ذرا سوچ کے بتانا کیوں کہ یہی بات سب سے اہم ہے، اس پورے واقعے میں!!!"

دونوں نے کافی دیر سوچا اور بالآخر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ "اگر مکھی نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا!!"

"ہاہا!" وہ ہنسا۔ "تم لوگ شیرا دیکھ کر مکھی بنتے ہی کیوں ہو؟"

ان دونوں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

کیا آپ کے پاس اس کا جواب ہے؟ ذرا سوچ کر بتائیں، کسی اور کو نہیں، صرف اپنے آپ کو کہ ہم برائی اور اچھائی میں فرق جانتے ہیں تو عارضی لذت اور فائدے کے لیے برائی کیوں کرتے ہیں۔☆

بلا عنوان کے کچھ عنوانات، بغیر انعام کے، بہ ذریعہ قرعہ اندازی

فاطمہ نصرت، سانگھڑ (گرائے کم نہیں ہوں گے، کم بخت! اتنی جگہ نہیں، تعلیم و تربیت کی ڈاک ہے۔)

1۔ عائشہ وحید، کراچی ("تعلیم و تربیت کا گدھا، گھر کا نہ ڈاک کا")

2۔ محمد معظم نواز، جھنگ ("ارے چنو میاں! صبر کرو منزل قریب ہی ہے")

3۔ یزید حسن، راولپنڈی ("آج تو مدیر بے ہوش جائیں گے")

4۔ محمد فضل الرحمان، جھنگ ("تعلیم و تربیت ہوا اتنا مقبول کہ بن گیا بے چارے گدھے کا محلول")

5۔ ثنا صابر، جہلم ("ڈاک خانے کم پڑ گئے ہیں تیرے خطوط کے لیے")

6۔ رضوانہ خورشید، اسلام آباد ("ایڈیٹر صاحب! باقی اگلے پھیرے میں")

7۔ مدثر کرم شہزاد، سرگودھا ("ٹیک اٹ ایزی یارا")

8۔ شفق شکیل اقبال، سیال کوٹ ("تم دنیا کے پہلے گدھے ہو، جو کسی دفتر میں کام کرتے ہو")

9۔ مریم حسنات بگوی، اسلام آباد ("ایڈیٹر صاحب کو خط شائع نہ کرنے کے بہانے آگئے")

10۔ خلیل الرحمان، کبیروالہ ("ارے بھائی! مار کے چھوڑو گے کیا؟")

11۔ اے دوستو! میں تو چلا ایڈیٹر کے ہوش اڑانے
محمد زبیر ارشد، ملتان

12۔ آج تعلیم و تربیت کو ہزار ہزار روپے کا خط دوں گا۔
محمد اویس مصطفوی، اسلام آباد

13۔ ردی کی ٹوکری سے نکال کر لا رہے ہو؟
زیب النساء، لاہور

14۔ اتنی زیادہ ڈاک تو عمرو عیار کی زنبیل میں بھی نہیں سما سکتی۔ عمر فاروق، ہری پور ہزارہ

گرمی کی چھٹیاں

گرمی کی چھٹیاں ہیں
سب کتنے شاداں ہیں

میلے میں جا رہے ہیں پکنک منا رہے ہیں
دیکھو جدھر بھی بچے دھومیں مچا رہے ہیں

گرمی کی چھٹیاں ہیں
سب کتنے شاداں ہیں

جاتا نہیں ہے مکتب اپنے ہیں روز اور شب
بھولے ہوئے ہیں سب کچھ دل کو نہیں ہے غم اب

گرمی کی چھٹیاں ہیں
سب کتنے شاداں ہیں

اب چھوڑ کر ٹھکانے سب چھٹیاں منانے
مل جل کے جا رہے ہیں دیکھو مزے اڑانے

گرمی کی چھٹیاں ہیں
سب کتنے شاداں ہیں

کوئی مری گیا ہے [illegible] کوئی چلا ہے
گرمی کی چھٹیوں کا اک اپنا ہی مزہ ہے

گرمی کی چھٹیاں ہیں
سب کتنے شاداں ہیں

یہ بھولنا نہ کوئی پڑھنا بھی ہے ضروری
مکتب کھلیں تو بھائی دیکھو نہ ہو [illegible]

ضیاء الحسن ضیاء، کراچی

چڑیا گھر کراچی کا

نسرین شاہین (کراچی)

کراچی شہر کو پاکستان کا جدید ترین اور انتہائی ترقی یافتہ شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے، اس شہر میں بھرپور اور مربوط تاریخی حوالے بھی موجود ہیں۔ اس شہر میں کئی تفریح گاہیں بھی موجود ہیں، جن میں ایک چڑیا گھر بھی شامل ہے، جہاں گھر بھر کے لئے اچھی تفریح موجود ہے۔ چوں کہ چڑیا گھر میں مختلف اقسام کے جانور اور پرندے موجود ہوتے ہیں، اس لئے چڑیا گھر بچوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ یہاں ہم ننھے قارئین کے لئے کراچی کے چڑیا گھر کے بارے میں معلومات فراہم کررہے ہیں تاکہ آپ جب بھی کراچی آئیں تو چڑیا گھر کی سیر کے لئے بھی ضرور جائیں۔

میونسپل گارڈن جو 1872ء میں گاندھی گارڈن کے نام سے قیام میں آیا، بیسویں صدی میں اسے ملک کے سب سے قدیم زولو جیکل گارڈن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ چڑیا گھر دنیا کے سب سے مشہور زولوجیکل گارڈن Bron x 200 سے بھی پرانا ہے۔ کراچی زو 33 ایکڑ اراضی پر محیط ہے۔ اس میں مختلف اقسام کے جانوروں کے لئے تقریباً 117 پنجرے بنائے گئے ہیں، جہاں مختلف نوعیت کے جانور رکھے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ چڑیا گھر کراچی شہر کے مخیر حضرات کے تعاون سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے گیٹ کا عطیہ سر محمد آغا خان نے دیا تھا، جس کی تختی گیٹ پر موجود ہے۔ چڑیا گھر کا انتظام 1953ء میں میونسپل کارپوریشن کے حوالے کیا گیا۔ قیام پاکستان سے قبل اس کا نام "گاندھی گارڈن" تھا، بعد میں "زولو جیکل گارڈن" رکھا گیا۔

چڑیا گھر کی سیر کرنے والے بچوں کو جانوروں اور پرندوں کے بارے میں کافی علم حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب ہم بندر کے پنجرے کے پاس جاتے ہیں تو بندروں کو اچھل کود کرتے ہی دیکھتے ہیں کیوں کہ قدرت نے درختوں پر چڑھنے اور اترنے کی بہترین صلاحیت بندروں کو عطا کی ہے۔ بندروں کی دم ان کے لئے نہایت کار آمد ثابت ہوتی ہے کیوں کہ بندر کی دم درخت کی شاخوں سے لپٹ کر اوپر چڑھنے، اترنے اور پھلانگنے میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہم آپ کو یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ برازیل میں بندروں کی ایک قسم ایسی پائی جاتی ہے، جس کی چیخیں تین تین میل تک سنائی دیتی ہیں۔

بندر کے بچے اپنی زندگی کا پہلا سال ماں کی پیٹھ پر ہی سوار رہ کر گزارتے ہیں اور پھر ان میں آہستہ آہستہ خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

آگے جا کر ایک بڑے پنجرے میں شیر موجود ہے، جس کے آس پاس کے پنجروں میں چیتا اور ریچھ وغیرہ بند ہیں جو ہر وقت غضب ناک حالت میں نظر آتے ہیں۔ شیر اور چیتے کے علاوہ جیگوار اور پیوما بلیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک تن درست و جوان ببر شیر کا وزن لگ بھگ 550 پونڈ یعنی 7 من کے قریب ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ببر شیر نہایت پھرتیلا اور خود اعتماد ہوتا ہے۔ ببر شیر عام طور پر غروب آفتاب کے وقت شکار کے لئے نکلتا ہے اور کوئی ہی جانور اس کے وار سے بچ سکتا ہے۔ شیرنی اپنے بچوں کو ایسی تربیت دیتی ہے کہ وہ خود بہت جلد اپنا شکار تلاش کرنے لگتے ہیں۔ جیگوار اور پیوما کی عادتیں بھی کم و بیش شیر جیسی ہوتی ہیں۔ چیتا اپنی رفتار میں کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ ویسے چیتا بھی بڑا خون خوار جانور ہے اور اپنے شکار پر بری طرح جھپٹتا ہے۔

ہاتھی بچوں کا پسندیدہ جانور ہے۔ کراچی کے چڑیا گھر میں ہاتھی کی سیر کا بھی خاص انتظام تھا۔ ہاتھی اپنی پیٹھ پر کئی لوگوں کو بیک وقت بٹھا کر سیر کراتا ہے۔ ہاتھی دنیا کا سب سے بھاری بھر کم جانور ہے۔ پیدائش کے وقت اس کے بچے کا وزن تقریباً 200 پونڈ ہوتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہاتھی کا وزن چھ ٹن تک پہنچ جاتا ہے۔ ہاتھی اپنی سونڈ سے ہوا کی سمت معلوم کرتا ہے اور شاخیں، پھل اور پتیاں وغیرہ توڑ کر اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ ہاتھی اپنی سونڈ میں پانی بھر کر پیتا ہے اور جب گرمی محسوس کرتا ہے تو سونڈ کا پانی اپنے جسم پر ڈال کر نہاتا بھی ہے۔ ہاتھی کی یومیہ خوراک ساڑھے چھ من سبزہ، پتیاں اور شاخیں وغیرہ ہیں۔

ہاتھی بڑا محنتی اور وفادار جانور ہے۔ اگر اس سے پیار کیا جائے تو اشاروں پر کام کرتا ہے۔ بچے ہاتھی کی سواری سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ چڑیا گھر میں انارکلی نامی ہاتھی نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ بچے اس میں بہت زیادہ دل چسپی لیتے تھے اور اکثر والدین اپنے بچوں کو اس پر سواری کرانے کے لئے چڑیا گھر لاتے تھے لیکن اس کی موت کے بعد انتظامیہ اب تک اس خلاء کو پر نہیں کر پائی۔

چڑیا گھر میں پھرتے ہوئے ڈھلان میں اتر کر قدرے گہرائی میں بنے ہوئے بڑے پنجروں میں ریچھ نظر آتے ہیں جو اکثر پانی میں نہا رہے ہوتے ہیں اور بعض شور مچا رہے ہوتے ہیں۔ بڑے ریچھ کا وزن تقریباً سات فٹ من ہوتا ہے اور ان کی پسندیدہ غذا میں سبز چارا، مچھلی، شہد، مینڈک اور پھل وغیرہ شامل ہیں۔

لمبی ٹانگوں اور بڑی گردن والا اونچا چرندہ زرافہ بھی بچوں کی دل چسپی کا باعث بنتا ہے۔ زرافے کا عام قد تقریباً 16 یا 17 فٹ ہوتا ہے، اس کا دل دنیا کے تمام جانوروں میں سب سے بڑا ہوتا ہے، اس کا وزن تقریباً 12 من یا کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ زرافے کی سب سے خاص بات یہی ہے کہ اس جانور کو "گونگا" جانور کہا جاتا ہے۔ اس کی

لمبی گردن اونچے اونچے درختوں کی شاخوں کے پتے کھانے میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ قدرت نے ہر جانور میں کوئی نہ کوئی ایسی صلاحیت رکھی ہے جو اسے دوسرے جانوروں سے ممتاز بناتی ہے۔

دودھ پلانے والے جانور یعنی میملز (Mammals) کی خاص پہچان ہوتی ہے کہ تمام جانوروں کے جسم پر بال ہوتے ہیں اور یہ انڈے نہیں بلکہ بچے دیتے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ وہیل مچھلی اور رات کو اڑنے والا پرندہ چمگادڑ بھی دودھ پلانے والے جانوروں میں شامل ہیں۔ کراچی کے چڑیا گھر میں میملز کے علاوہ بھی جانور موجود ہیں۔ جب ہم کراچی کے چڑیا گھر میں "ریپٹائل ہاؤس" یعنی رینگنے والے جانوروں کا جائزہ لیتے ہیں تو قدرت کی کئی انوکھی باتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی ایک اپنی ہی الگ دنیا ہے۔ چڑیا گھر میں مختلف اقسام کے سانپ موجود ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مگرمچھ اور کچھوے بھی یہاں موجود ہیں اور آنے والوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ لیکن ان تھوڑے بہت حشرات پر کوئی تفصیل یا ان کے بارے میں کوئی معلومات درج نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں کوئی خاطر خواہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ یہی صورت حال بعض جانوروں کی ہے جن کے پنجرے کے باہر ان کے متعلق کوئی معلومات درج نہیں، اس کے برعکس دنیا کے دیگر چڑیا گھروں میں یہ صورت حال مختلف ہے۔ پیارے بچو! ان جانوروں کو دور سے ہی دیکھنا چاہیے، نہ تو ان کے قریب جائیں اور نہ ان کو کوئی غلط سلط شے کھانے کو دیں۔ کئی قیمتی جانور لوگوں کی چیزیں کھا کر مر جاتے ہیں۔

چڑیا گھر کئی جانوروں، پرندوں اور حشرات کو ایک جگہ جمع کرنے کے لئے قائم کئے جاتے ہیں۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ لوگوں کو جانوروں سے محبت ہے یا پھر انہیں قید کر کے انہیں اپنا محکوم بنا کر خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تاہم اگر ہم انہیں بہتر طور پر رکھ سکتے ہیں اور جانوروں کو ان کا قدرتی ماحول مہیا کر سکتے ہیں تو انہیں قید کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ البتہ آنے والوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ انہیں تنگ نہ کریں، انہیں ماریں نہیں۔

جانور قدرت کی وہ بے زبان مخلوق ہیں جو جذبات و احساسات بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے انہیں ستانا نہیں چاہئے بلکہ ان کے لئے پیار بھرے جذبات رکھنے چاہئے تاکہ وہ ہمارے دوست بن جائیں۔ تو پھر آپ دیکھیں گے کہ جانور محبت کا جواب محبت سے دیتے ہیں۔

تعلیم و تربیت ماہ و سال کے آئینے میں

مرتبہ: محمد بشیر راہی

چیف ایڈیٹر محترم عبدالسلام صاحب اور ایڈیٹر محترم ظہیر السلام صاحب کی سرپرستی میں مندرجہ ذیل معاون مدیران سرگرم عمل رہے۔

			مہینے	سال
1۔	محترم سعید لخت	اگست 1979ء تا ستمبر 1979ء	2	
2۔	محترم رشید اکبر	اکتوبر 1979ء تا اپریل 1980ء	7	
3۔	محترم سعید لخت	مئی 1980ء تا جولائی 1980ء	3	
4۔	محترم خالد بزمی	اگست 1980ء تا دسمبر 1982ء	5	2
5۔	محترم اجمل وجیہہ	جنوری 1983ء تا فروری 1985ء	2	2
6۔	محترم سعید لخت	مارچ 1985ء تا اپریل 1985ء	2	
7۔	محترم خالد بزمی	مئی 1985ء تا ستمبر 1986ء	5	1
8۔	محترمہ سیماں علی	اکتوبر 1986ء تا مئی 1988ء	8	1
9۔	محترم سعید لخت	جون 1988ء تا جنوری 1997ء	8	8
10۔	محترم رضوان ثاقب	فروری 1997ء تا مارچ 2002ء	2	5
11۔	محترم جاوید امتیازی	اپریل 2002ء تا اگست 2005ء	5	3
12۔	محترم جنید احمد	ستمبر 2005ء تا مارچ 2008ء	7	2
13۔	حامد مشہود	مارچ 2008ء سے تادم تحریر		

محترم سعید لخت اس ریکارڈ سے پہلے بھی تعلیم و تربیت کے معاون مدیر رہے۔ وہ ایک بہت اچھے کہانی کار اور اعلیٰ درجے کے اردو دان ہیں۔ وہ عمر بھر فیروز سنز میں علمی و ادبی کام کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی دراز کرے۔

محترم جاوید امتیازی بہت اچھے قلم کار، شاعر اور مدیر تھے۔ ایک سنگ دل شخص نے چند روپوں کی خاطر ان کی جان لے کر ہمیں ایک علم دوست اور عاشق رسولؐ سے محروم کر دیا۔ اللہ مالک ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین!

جگ میلہ

اسے نہ سمجھو رام کہانی — جس تن لاگی سو تن جانی
تو ہے سب کا کوئی نہ تیرا — کہہ گئے پہلے بات سیانی
دولت کی اک بارش آئی — پیاس مگر نہ بجھنے پائی
پاپی من ہے پیاسا تب سے — جب سے بنا ہے یہ جگ فانی
کہاں چلا ہے ڈھونڈنے کس کو — دیکھ نہ پایا کوئی بھی جس کو
من میں تیرے رہے ہمیشہ — ذات ہے جس کی بڑی نورانی
دیکھ سرہانے کون کھڑا ہے — جانے سے اب کیوں ڈرا ہے
گھات لگا کر آ بیٹھا وہ — بھاگ کے دیکھ اب دلبر جانی
اب بھی وقت ہے توبہ کر لے — زادِ سفر سے جھولی بھر لے
کر جا جس سے راضی ہو وہ — تو ہے بندہ وہ رحمانی
چھوڑ نہ اس کو جو ہے تیرا — دل نہ سمجھا جوگی پھیرا
چار دنوں کا یہ جگ میلہ — ہوش میں آ نہ کر نادانی

میاں نذر حسین، جہلم

ہونہار مصور

امن و دوستی

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں

علی رضا، قصور (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)

اقصیٰ طاہر، لاہور (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)

عیشہ بٹ، جہلم (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

محمد طاہر وسیم، جلال پور جٹاں (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)

جویریہ سعدیہ، چشمہ بیراج (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

راجا عادل، اسلام آباد (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

کچھ مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: مدیحہ زینب پنڈ دادن خان۔ انیس الرحمان مشوانی ہری پور۔ ماریہ ناز کامرہ۔ محمد مقصود نواز، محمد عثمان قاسمی جھنگ۔ ذیشان اصغر جوہر آباد۔ درخشاں جہلم۔ عاقب رباب چکرال۔ ربیہ حبیب واہ کینٹ۔ مشعال ریاض مغل، شرجیل مغل ایبٹ آباد۔ آمنہ ذوالقدر راولپنڈی۔ محمد سعد اسلام آباد۔ عمر فاروق ہری پور ہزارہ۔ نور فرید، خدیجہ فرید، ولید فرید، کراچی۔ خنساء رضوان، موسیٰ عمران، خولہ رضوان، منتہیٰ عمران، حنظلہ شعیب، حذیفہ شعیب، لاہور۔ نعمان اسلم، منان اسلم، انعم اسلم، ماہ نور اسلم، ثمینہ اسلم ہاسلم ناگی لاہور۔

جولائی کا موضوع: دہشت گردی کو مار بھگاؤ

آخری تاریخ 8 جون

اگست کا موضوع: پاکستان سلامت رہے

آخری تاریخ 8 جولائی

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

میری زندگی کے مقاصد

پڑھ لکھ کر اپنے پیارے وطن اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کروں گا۔۔۔

میں خوب پڑھوں گا اور انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

میری زندگی کا مقصد مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرانا ہے۔۔۔

انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔۔۔

میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پاک دھرتی کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دوں گی۔

میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور اچھے اچھے کام کروں گا۔۔۔

آرمی میں جا کر فوج کا کھویا ہوا وقار بحال کروں گا۔۔۔

میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور ملک کا نام روشن کروں گا۔

میں الیکٹریکل انجینئر بن کر ملک سے بجلی کا بحران ختم کروں گا۔ ان شاء اللہ

میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔۔۔

ٹیچر بن کر تعلیم عام کرنا۔

ملک کی خاطر جان دے کر "نشانِ حیدر" کا اعزاز حاصل کروں گا۔

میں بڑا ہو کر پائلٹ بننا چاہتا ہوں اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔۔۔

میرا مقصد ہے کہ میں اچھی انسان بنوں اور دوسروں کے کام آؤں

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کرنا، دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کرنا۔۔۔

میں پڑھ لکھ کر نہ صرف والدین بلکہ اس ملک اور انسانیت کی خدمت کروں گا۔

ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔
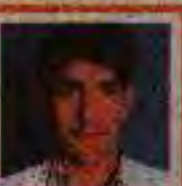
میں چاہتا ہوں کہ میں ایک اچھا وکیل بن کر غریب لوگوں کے مفت کیس کروں۔

میں فوجی بن کر اپنے پیارے پاکستان کی خدمت کروں گا۔ اسلام کی خاطر جنگ کروں گا اور شہادت پاؤں گا۔۔۔

میں آرمی آفیسر بن کر پاکستان کے دشمنوں اور دہشت گردوں کا خاتمہ کروں گا۔
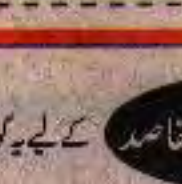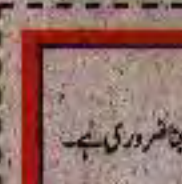
میں بڑا ہو کر عالم دین بنوں گا اور ملک و قوم کو گمراہی کے اندھیرے سے نکالوں گا

میری زندگی کے مقاصد کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام .... شہر ....

مقاصد ....

....

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 8 جون 2009ء

مئی 2009ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے ہزاروں عنوانات موصول ہوئے، جن میں سے مجلسِ ادارت کو 200 عنوانات پسند آئے اور یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی کتب کے انعامات کے حق دار قرار پائے۔

☆ سمیر صغیر، گوجر خان (خطوط کے بہانے میں بھی تعلیم و تربیت کی بھوکی نوکری دیکھ لوں گا)

☆ آنسہ حجاب، پشاور (رشک ہے تعلیم و تربیت تیری قسمت پر)

☆ جواد احمد بلگرامی، لاہور (چل میرے ساتھی! خوش ہو جا، یہ آخری پھیرا ہے)

☆ محمد ذیشان تشنہ مغل، ہمدرد ی

(ڈاکیے بھائی! میری کمر کی انشورنس کراؤ، ورنہ ڈاک بائی سائیکل پر لے کر جاؤ)

☆ بنتِ منظور اکبر، راول پنڈی (گدھے تمہاری چھٹی! اب آئے گا ہاتھی۔۔۔!!!)

باقی عنوانات اندر ملاحظہ کریں